مضامینِ ابوالکلام آزاد

جلد دو

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ

إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

مضامینِ ابوالکلام آزاد

مُرتّبہ

بدرالحسن بی اے (جامعہ)

ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

مطبوعہ جناح پریس، دہلی
مئی سنہ ۴۲ء

فہرست

مقدمہ

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ حرم خیز

کتنے بابرکت اور کتنے محترم ہیں وہ لوگ جن کے دم سے زندگی کے مرجھائے ہوئے پودے پھر سے جی اُٹھتے ہیں جن سے تاریکی کو روشنی، جہل کو علم، اور روح کو عرفان حاصل ہوتا ہے

جو گرتوں کو سنبھالتے ہیں، بھٹکتوں کو راہ دکھاتے ہیں اور سوتوں کو جگاتے ہیں۔ ظلم و عدوان، طغیان و تمرد، خواجگی و قیصریت جب ان باسفا حق پرستوں کے مقابلے پر آتی ہے تو یہ لوگ اُس کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کے انتشار کا آغاز تھا۔ خلافت الٰہیہ کے علم بردار اب اپنی حفاظت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ انھیں ان کے گھروں سے نکالا جا رہا تھا اور دنیا کی تمام صلیبی قوتیں اپنی پوری طاقت کے ساتھ تلی ہوئی تھیں کہ اللہ کی زمین پر کوئی اللہ کا نام لینے والا باقی نہ رہے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کی جاہ و حشمت، شان و شوکت، ہیبت و صولت، نقشِ ماضی اور قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ سلطنت مغلیہ کے نقوش

آہستہ آہستہ بالکل مٹ چکے تھے۔ نئی روایات نے پرانی روایات کی جگہ لے لی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے اور اُن کی روحوں پر موت کی پژمردگی طاری ہو چکی تھی۔ امراء و کبار عیش و عشرت میں مست ہو کر غم کو غلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور عام مسلمان زندگی کی حقیقتوں کو جام شراب کی رنگینیوں میں گم کر دینا چاہتے تھے۔ اُن کی قومی سیرت جو اُن کا طرۂ امتیاز تھی بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ اُن میں صداقت، جوش، ہمت، شجاعت ایسے بلند جذبات کی جگہ تعصب پست ہمتی، غلامی، جھوٹ، ریاکاری جیسے رکیک جذبات نے گھر کر لیا تھا۔ اس زبردست انقلاب نے اُن پر سکتہ طاری کر دیا تھا اور وہ نقش حیرت بن کر رہ گئے تھے۔ اُن کے پاس دماغ تھے مگر صلاحیت فکر سے عاری، اُن کے پاس آنکھیں تھیں مگر بصارت سے محروم، اُن کے پاس کان تھے مگر سننے کی طاقت سے عاجز، ہاں اُن کے پاس دل بھی تھے مگر درد نا آشنا اور خالی از اضطراب!

منٹو مارلے اصلاحات اور تقسیم بنگالہ کی تنسیخ نے اُن کی آنکھیں کھولدیں۔ اب انھیں تلاش تھی ایک ایسے مجاہد کی جو حریت کے نام پر کٹ مرنا جانتا ہو۔ ایک ایسے مجدد کی جو ملک کے جسد بے روح میں حیات تازہ پھونک دے۔ اور ایک ایسے امام کی جو بہ ایں تیرگی انھیں منزل کا پتہ دے۔

مسلمان اسی انتظار میں تھے کہ ۱۹۱۲ء میں بنگال کے خطہ سے

وہ رعد آسا صدا بلند ہوئی جس نے سارے عالم میں انقلاب کی لہر دوڑا دی، اور مسلمانوں کے جمود اور تن آسانی کو تارِ عنکبوت کی طرح لرزاں کر دیا۔ یہ آواز تھی ایک بیس سالہ نوجوان کی جو طوفان بنکر اُٹھا اور ساری دنیا کے احساسات پر چھا گیا۔ یہ آواز تھی اُس مجاہدِ اعظم کی جس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ زمین کا چپہ چپہ ظلم و تعدی اور جبر و استبداد کے بوجھ سے دبا چلا جا رہا ہے، جس کے کانوں میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے خلاف احتجاج کی آوازیں گونج رہی تھیں اور جو بلقان کی بیواؤں اور یتیموں کی فریادیں سُن رہا تھا۔ یہ آواز تھی اُس مردِ مومن کی جو ازل سے ایک دردمند دل لیکر آیا تھا، جو مسلمانوں کے خیال سے تڑپ اُٹھتا تھا۔ یہ آواز اُس مردِ مجاہد کی تھی جو تمام دنیا کو پائے استحقار سے ٹھکراتا ہوا مشہدِ آزادی و حریت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ نوجوان، یہ مجاہدِ اعظم، یہ مردِ مومن کون تھا؟ احمد المکی ابوالکلام آزاد جس نے خوابِ غفلت میں ڈوبی ہوئی قوم کو جھنجھوڑا اور اُنھیں آواز دی:۔

> "میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کر دوں، جس کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت اور ہشیار ہو جائیں؟ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں، جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ ملت کے

زخموں پر نازہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت وحمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ! کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار، اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز، اس صفِ ماتم کے فغاں سنج، اور اس کشتی طوفانی کے مایوس مسافر جن کی موت وحیات کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش۔ روتے ہیں، یا مایوسی سے چپ و راست نگراں، مگر نہ ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے اور نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام ہے اور نہ ارادہ دل میں عمل کا ولولہ۔ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دئے ہیں اور گھر والے سوتے بھی نہیں، مگر اب تک آنکھ ملنے سے مہلت نہیں ملی ہے۔ جب کسی کے گھر میں آگ لگتی ہے تو محلہ کے دوست، دشمن سب ہی پانی کے لئے دوڑتے ہیں، لیکن اسے رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو! یہ کیا ہے کہ تمہارے گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے، اور شعلوں کی بھڑک سخت مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو۔ پھر اگر اسی وقت کے منتظر تھے، تو کیا نہیں سنتے کہ وہ وقت

آگیا ہے۔ اگر تم کشتی کے ڈوبنے کا انتظار کر رہے تھے، تو کیا نہیں دیکھتے کہ اب اس میں دیر نہیں؟ اور آہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی سیزدہ صد سالہ کشتی، جو بارہا ڈوبی اور بارہا اچھلی، اور نہیں معلوم اب ڈوبنے کے بعد ہمیشہ کے لئے سطح عالم سے ناپید ہو جاتی ہے، یا اس کے ٹوٹے ہوئے تختے اور تار تار بادبان کے ٹکڑے سمندر کی موجوں کا چند گھنٹے اور مقابلہ کرتے ہیں"

مسلمانوں نے اس آواز کا جواب دیا اور اُس مرد مجاہد کے پیچھے چل پڑے۔ مگر جس راستے پر چلے وہ ایسا راستہ نہ تھا کہ منٹوں، گھنٹوں یا برسوں میں طے ہو جاتا۔ صعوبت راہ سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ غیار تو تاک میں بیٹھے ہی تھے۔ تھکے ہوئے قدموں کی لغزش کو بھانپ گئے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کا پرانا سبق انھوں نے پھر دہرانا شروع کر دیا۔ برسوں کی قربانیوں کے بعد جو چیز حاصل ہوئی تھی مسلمان اس سے بے پروا ہو کر ایک دفعہ پھر عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے۔ اتفاق سے انھیں ایسے لیڈر بھی مل گئے جنھوں نے اُن کے سامنے ایک ایسی راہ عمل پیش کر دی جس میں نہ کسی قسم کا خطرہ تھا، نہ کوئی صبر آزما منزل مگر اس مرد مجاہد نے اس کی پروا تک نہ کی اور مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ اُس کی قوم کے کتنے افراد آج اُس کے ساتھ ہیں۔ اُس نے جس راستہ پر قدم رکھا تھا اُس پر بڑھتا ہی چلا گیا، اور آج بھی آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنی قوم

سے دور، نہ معلوم کہاں ظلم وجور اور جبر و تشدد کے خون آشام دیوؤں سے برسرِ پیکار رہے۔

یہ اسی درد آشنا مسلمان کے مضامین کی دوسری جلد ہے اسے پڑھ کر مسلمانوں کو پھر اپنا بھولا ہوا راستہ یاد آجائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت مشکور ہوئی۔

ابھی اس کی دو جلدیں اور باقی ہیں۔ اگر سیاسی فضا اور موافق حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ بہت جلد بقیہ مجموعے بھی آپ کے سامنے ہوں گے۔

مولانا کے بعض مضامین اتنے طویل تھے کہ اگر انھیں پورا نقل کیا جاتا تو ایک جلد میں دو تین مضمون سے زیادہ نہ آسکتے۔ اس لئے بعض مضامین میں ہم نے مجبوراً بعض حصوں کو نظر انداز کر دیا ہے جس کا ہمیں افسوس ہے۔

میں جناب حسین حسان صاحب اڈیٹر پیام تعلیم۔ بشیر احمد صاحب بی اے جامعہ۔ برکت علی صاحب بی اے جامعہ کا نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کے سلسلہ میں اپنے مفید مشوروں سے میری رہنمائی کی۔

علاء الدین خالد صاحب منیجر مکتبہ جامعہ، حکیم حافظ محمد اسمٰعیل صاحب اور حکیم حافظ عبد الجلیل صاحب کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں میری ہر طرح مدد کی۔

سیاست

۱ - الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم	الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء
۲ - صبح امید	" ۲۲ - ۲۹ ستمبر ۱۲ء
۳ - القسطاس المستقیم	الہلال ۹، ۱۶، ۲۳ اکتوبر
	" ۶ نومبر ۱۹۱۲ء
۴ - الجہاد فی سبیل الحریت	" ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء

الہلال کے مقاصد

اور پولیٹیکل تعلیم

اس ہفتہ ہمارا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھینگے لیکن ایک بزرگ دوست کی تحریر نے اور زیادہ ضرورت پیدا کر دی۔ وہ لکھتے ہیں :-

" ..... ان سات نمبروں کو بغیر ایک حرف چھوڑے ہوئے پڑھ لینے کے بعد بھی صاف صاف معلوم نہیں ہوتا کہ آپ قوم کو کس قسم کی پولیٹیکل تعلیم دینا چاہتے ہیں؟ ایک بہت بڑا بنیادی اصول جو آپ کا معلوم ہوتا ہے اور اسی نے آپ کی بے انتہا عزت میرے دل میں پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے تمام امراض کا علاج مذہب اور قرآن کو سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان میں اسلام کی اصلی نہ کہ رسمی رُوح پیدا کی جائے۔ اس اصول کو اور بھی بہت سے لوگ جانتے اور رکھتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ آپ سے بڑھ کر اس کو کوئی عمل میں نہیں لا سکتا۔ ابھی صرف چند تحریریں ہی آپ کی نکلی ہیں، لیکن انہی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی نظر قرآن مجید اور اس کے حقائق و معارف پر کیسی وسیع اور گہری ہے؟

لیکن معاف کیجیے گا آپ اپنے مذہبی رنگ میں پالیٹکس کو بھی خلط ملط کر دیتے ہیں اور اس طرح ملا دیتے ہیں کہ پہچان مشکل ہو جاتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح الہلال کے صدہا ناظرین کو بھی یہی خلجان پریشان کرتا ہوگا۔ پس آپ کو چاہیے کہ سب سے پہلے آپ اپنی پالیسی کی تشریح کر دیں اور کم از کم پولیٹکل تعلیم کو مذہبی تعلیم سے الگ کر کے صاف صاف بتلا دیں کہ آپ قوم کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں؟ ایک راستہ تو وہ ہے جس پر آج تک چلتے رہے، دوسرا راستہ اعتدال پسند ہندوؤں کا ہے جو برٹش شہنشاہی کو قائم رکھ کے اپنے حقوق طلب کرتے ہیں تیسری جماعت ان ہندی انارکسٹوں کی ہے جو بم کے گولے اور ریوالور چلا کر بھارت ماتا کو اجنبیوں سے خالی کرنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم آپ بتلا دیں کہ آپ کس جماعت میں ہیں اور کس کے ساتھ ہم کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ ...... اس وقت ہم یا تو آپ کا ساتھ دینگے اور یا مذہبی تعلیم میں شریک رہینگے اور اور دوسرے صیغوں سے الگ ہو جائینگے ...... میرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے نہیں معلوم کس قدر دقتیں اٹھا کر ایک ایسا بڑا کام شروع کیا ہے ...... آپ کی صداقت اور خلوص نیت میں بھی شک نہیں اور علم و فضل بالخصوص مذہبی معلومات کا درجہ تو میری تعریف سے بھی بلند ہے یہ چیزیں ہمیشہ ہماری بدقسمت قوم کو میسر نہیں آتیں؛ ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ یہ تمام قوتیں ضائع جائیں اور قوم آپ کی قابلیتوں سے محروم ہو جائے ——"

ہمارا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے الہلال کے مقاصد پر ایک جامع سلسلہ مضمون شروع کرینگے اور ایک مرتب صورت میں بتلا دینگے کہ ہمارے سفر کے حدود و مقاصد کیا کیا ہیں؛ لیکن بعض مسائل درمیان میں ایسے آ گئے جن پر

بے اختیار قلم کو حرکت ہوئی اور تمہید سے پہلے اصل کتاب شروع کر دینی پڑی۔ لیکن ہم اپنے مکرم دوست کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس ضروری سوال کو چھیڑ دیا۔

اُنہوں نے جن الفاظ میں میرے مذہبی افکار و تحریرات کی تعریف کی ہے، یہ اُن کا بزرگانہ حسنِ ظن ہے لیکن بلا شائبہ انکسار عرض کرتا ہوں کہ اس کی اہلیت کسی طرح اپنے اندر نہیں پاتا، ممکن ہے کہ مذہبی باتیں تھوڑی بہت مجھے معلوم ہوں لیکن قرآن کریم کے معارف تو اتنے ارزاں نہیں جس کو میں اپنی حرف شناسی دے کر خرید سکوں۔ میں تو ان کے خط میں اپنی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کر بے اختیار کانپ اُٹھا۔ اگر اس کے حقائق و اسرار کے فہم کے لیے عربی دانی کی ضرورت ہوتی تو میں عربی کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں، اگر مذہبی معلومات کی ضرورت ہوتی تو ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اگر کتب تفاسیر کے مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کتابوں کی میرے پاس کمی نہ تھی لیکن اس کے لیے یہ تمام باتیں بے کار ہیں، پہلی شرط اتقا اور تزکیۂ قلب ہے اور ساری محرومی اسی میں ہے کہ اس سے محروم ہوں۔ جو دل زہد و تقویٰ سے محروم اور ہوائے نفسانی و آلائش دنیا پرستی میں گرفتار ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کے حقائق و معارف کا تجلی گاہ نہیں بن سکتا۔ علم و فضل اس کے لیے بالکل بیکار ہے اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب
اینہا ہمہ آرایش افسانۂ عشق است

یقین فرمائیے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں بالکل سچ ہے۔ قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں گو وہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کرلے۔ انصاف فرمائیے کہ جب حالت یہ ہو تو پھر میری اس مقام میں کیا ہستی ہے!

ان کے خط میں کئی باتیں قابل غور ہیں:۔

۱۔ پولیٹکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں۔

۲۔ ہندوستان میں اس وقت جو پولیٹکل گروہ ہیں اُن میں سے الہلال کس کا ساتھ دیتا ہے؟

امر اول کی نسبت گذارش ہے کہ یہ تو جناب نے اس بنیادی اصول کو چھیڑ دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کہیں کہ محراب خوشنما نہیں تو ممکن ہے کہ ہم بدل دیں، لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے تو معاف فرمائیے اس کی تعمیل سے ہم مجبور ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اُسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں، اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو "سراج منیر" کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے اسے ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہو جائیں گے کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لیے کہ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا، مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ورنہ پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل نہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز، اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین،

یقین فرمائیے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں بالکل سچ ہے۔ قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں گو وہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کرلے۔ انصاف فرمائیے کہ جب عالت یہ ہو تو پھر میری اس مقام میں کیا ہستی ہے!

ان کے خط میں کئی باتیں قابل غور ہیں:۔

۱۔ پولیٹکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں۔

۲۔ ہندوستان میں اس وقت جو پولیٹکل گروہ ہیں اُن میں سے الہلال کس کا ساتھ دیتا ہے؟

امر اول کی نسبت گذارش ہے کہ یہ تو جناب نے اس بنیادی اصول کو چھیڑ دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کہیں کہ محراب خوشنما نہیں تو ممکن ہے کہ ہم بدل دیں، لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے تو معاف فرمائیے اس کی تعمیل سے ہم مجبور ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اُسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں، اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو "سراج منیر" کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے اسے ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہو جائینگے

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لیے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں! ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ورنہ پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز، اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین،

تبیاناً لکل شیءٍ، بصائر للناس، ھادیٌ اھدیٰ الی السبیل، جامع اضرابِ امثال، بلاغ للنّاس، حاوی بحر و بر، اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے، اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو، خواہ سیاسی۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵ : ۱۵)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے، اُس کو جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا، اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔

دنیا میں کونسی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنی نسبت ایسے عظیم الشان دعوے کیے ہوں! اس آیت میں صاف تبلا دیا ہے کہ قرآن مجید روشنی ہے، اور روشنی ہے تو تمام انسانی اعمال کی تاریکیاں صرف اسی سے دور ہو سکتی ہیں۔ پھر کہا کہ وہ ہر بات کو کھلے کھلے طور پر بیان کر دینے والی ہے اور انسانی اعمال کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کے لیے اس کے اندر کوئی فیصلہ نہ ہو۔ اس ٹکڑے کی تائید دوسری جگہ کر دی کہ :-

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ   بے شک ہم نے اُن کو کتاب دی جس کو ہم نے

عَلٰی عِلۡمٍ هُدًی وَّ رَحۡمَۃً   علم کے ساتھ مفصل کر دیا ہے، وہ ہدایت بخش
لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ۔   اور رحمت ہے ارباب ایمان کے لیے۔

اس کے بعد پہلی آیت میں قرآن کو سُبل السلام کے لیے ہادی بتلایا کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اگر آپ کے سامنے پولیٹکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن سے نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولیٹکل گمراہیاں صرف اس لیے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست راہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا، ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ "صراط المستقیم" پر لے جانے والی ہے اور "صراط المستقیم" کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع و مانع ہے کہ ساری دنیا اسی کے اندر سمجھئے۔

افسوس ہے کہ طول بیانی کا موقع نہیں ورنہ اس بحث نے سیکڑوں آیتیں دماغ کے سامنے کر دی ہیں، ایک جگہ فرمایا:-

اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡیَانًا   (اے پیغمبر) ہم نے تجھ پر کتاب اُتاری جو ہر چیز کو
لِّكُلِّ شَیۡءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحۡمَۃً   کھول کھول کر بیان کر دینے والی ہے اور نیز ہدایت
لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ۝   بخش اور رحمت ہے صاحبان ایمان کے لیے۔

سورۂ یوسف کے آخری رکوع میں فرمایا:-

مَا كَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی وَ   قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ جو
لٰكِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ   صداقتیں اس سے پہلے کی موجود ہیں ان

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى — کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں ارباب ایمان کے
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞ — لیے ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت اور رحمت ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا — ہم نے انسان کے سمجھانے کے لیے اس قرآن
الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ — میں سب طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ
يَتَذَكَّرُوْنَ — نصیحت حاصل کریں۔

اِن آیات میں قرآن کا دعویٰ بالکل صاف ہے وہ ہر طرح کی تعلیمات کے لیے اپنے تئیں ایک کامل معلم ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی تعلیم صاف اور غیر پیچیدہ ہے بشرطیکہ اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى — تمام تعریفیں اُس خدا کے لیے ہیں جس نے
عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ — اپنے بندہ پر قرآن اُتارا اور اُس میں کسی طرح
عِوَجًا ۞ (۱۸: ۱) — کی پیچیدگی نہ رکھی۔

پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے ایک ضروری شعبہ یعنی سیاسی اعمال کے لیے دوسروں کے دروازوں کے سائل بنیں، حالانکہ خود قرآن اُن کے پاس ایک حکم اور ایک امام مبین ہے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ — اور ہر شے کو ہم نے اس کتاب واضح (قرآن)
مُّبِيْنٍ (۳۶: ۱۲) — میں جمع کر دیا ہے۔

دوسری جگہ اس کو تمام اُمور کے لیے قول فیصل بیان کیا:۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا — بیشک یہ قرآن ایک قول فیصل ہے، تمام اختلافات

هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶: ۱۴) واعمال کے لیے اور کوئی بے معنی و فضول بات نہیں۔

مسلمانوں کی ساری مصیبتیں صرف اسی غفلت کا نتیجہ ہیں کہ اُنھوں نے اس الٰہی تعلیم گاہ کو چھوڑ دیا اور سمجھنے لگے کہ صرف روزہ نماز کے مسائل کے لیے اس کی طرف نظر اُٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ اپنے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی اعمال سے اسے کیا سروکار؟ لیکن وہ جس قدر قرآن سے دور ہوتے گئے اُتنا ہی تمام دنیا اُن سے دور ہوتی گئی اور جس راہ میں قدم اُٹھایا گمراہی کی ظلمت سے دوچار ہوئے۔ اس وقت کی پیشین گوئی پہلے ہی قرآن نے کر دی تھی:-

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ قیامت کے دن رسول اللہ عرض کرینگے کہ
اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا خدایا میری اُمت نے اس قرآن کو ہذیان
الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵: ۳۰) سمجھا (اور اس پر عمل نہ کیا)

ہم نہیں سمجھتے کہ اگر نزول قرآن کے وقت مشرکان مکہ اس سے اعراض واغماض کرتے تھے تو ان میں اس سے زیادہ کیا تمرد و سرکشی تھی جتنی آج صدیوں سے تمام مسلمانانِ عالم، اور ان کا ہر طبقہ خواہ وہ مدعیانِ ریاست دینی کا ہو، یا مسند نشینان تخت دنیوی کا، بلا استثنا رکر رہا ہے؟ وہ اگر قرآن کی تلاوت کے وقت کانوں میں اُنگلیاں ڈال لیتے تھے یا کعبہ کے اندر شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے تھے کہ اس کی آواز کسی کے سُننے میں نہ آئے تو آج خود مسلمان کانوں کی جگہ دلوں کو بند کیے ہوئے ہیں اور شور مچانے کی جگہ گو خاموش ہیں مگر ان کے نفس نے انسانی ہنگاموں کا ایسا غل مچا دیا ہے کہ خدا کی آواز کسی کے کان میں نہیں پڑتی:-

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا	اے پیغمبر جس وقت تم قرآن پڑھتے
بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ	ہو، ہم تم میں اور اُن لوگوں میں
بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا وَّ	جنہیں آخرت کا یقین نہیں
جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ	ایک چھپا دینے والا پردہ ڈال دیتے
يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا،	ہیں، نیز ان کے دلوں پر غلاف ڈال
وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ	دیتے ہیں تاکہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور ان
وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا	کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں
(۱۷: ۴۶)	تاکہ سُن نہ سکیں ۔

پس اگر آپ کو یہ غلطیاں پریشان کیے ہوئے ہے تو افسوس ہے کہ ہم اُسے دور نہیں کر سکتے ۔ اگر ہم کو اپنے مقاصد بالتفصیل بیان کرنے کی مہلت نہیں ملی تو مضائقہ نہیں وہ نہایت مختصر لفظوں میں بھی آج سُنائے جا سکتے ہیں۔ ہم بالاختصار عرض کر دیتے ہیں کہ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی، سیاسی ہوں خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا صرف یہی ہے کہ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۳: ۵۷) اُس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقاداً انکار نہیں مگر عملاً یہ حال ہے کہ:-

الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ	اُنھوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم ایمان

وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ (۵: ۴۵) لائے ہیں لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں

خدا تم کو اپنے کلام کے آگے سربلند کرتا ہے، تم کیوں اس سے گردن موڑ کر انسانوں کے آگے ذلت کا سر جھکاتے ہو؟ اس کے سوا الہلال کی تعلیم کا اور کوئی مقصد نہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی تھی

اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ جو خدا کی طرف دعوت دے اور عمل اچھے

اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۳۲: ۳۱) کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولیٹکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے؟ پھر آپ نے ان کو گنوا بھی دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے۔ یہ تین راستے تو آج آپ کے سامنے نمودار ہوتے ہیں مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر ہزاروں ہستیاں منزلِ مقصود تک پہنچ چکی ہیں۔ آسمان و زمین کے فاطر نے جس وقت انسانوں کو آنکھیں دیکھنے کے لیے عطا فرمائیں اُسی وقت اس کے سامنے یہ راہ بھی کھول دی تھی۔ آدم نے اس پر قدم رکھا اور نوح نے پتھروں کی بارش میں اس کا وعظ کہا، ابراہیم نے اسی کی نشانی کے لیے قربانگاہ بنائی اور اسمٰعیل نے اس کے لیے اینٹیں چُنیں، یوسف سے مصر کے قید خانہ میں جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اُس نے راہنمائی کی، اور موسیٰ جب وادی ایمن میں روشنی کے لیے بیقرار ہوا تو اسی راہ کی تجلی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی، گلیل کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اسی راہ پر تھی اور پھر جب

خداوند سعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اُس نے دنیا کو دعوت دی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا	اللہ نے تمہارے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ	ہے جس پر چلنے کا اُس نے نوح کو حکم دیا،
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا	اور اے پیغمبر وہی تمہاری طرف اُتارا گیا
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا	کو حکم دیا کہ اس دین کے راستہ کو قائم رکھنا
فِيْهِ	اور اُس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہی وہ راہ ہے جس کی نسبت (یوسف صدیق) نے قید خانہ مصر میں یہ کہہ کر اپنا وعظ ختم کیا تھا کہ:۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	یہی سیدھا راستہ ہے مگر بہت ہیں جو
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۴۰)	نہیں جانتے۔

اور جس کی نسبت داعی اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہہ دے!

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى	میرا راستہ یہ ہے، تم سب کو اللہ کی طرف
اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ	بُلاتا ہوں میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں
اتَّبَعَنِيْ (۱۲: ۱۰۸)	سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی دین کے راستہ
	پر ہیں۔

الحمد للہ کہ ہم "وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" کے زمرے میں داخل ہیں اور اسی لیے جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بلکہ

اس چوتھی راہِ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ صراط المستقیم ہے۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنالے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ

مسلمانوں کے سامنے خود اُنکی پولیٹیکل راہ موجود ہے

آپ پوچھتے ہیں کہ "آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹکل گروہ موجود ہیں آپ اُن میں سے کس کے ساتھ ہیں؟" گذارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اُس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دُنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائیگی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں؟ خدا ان کو سر بلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت (والغیرۃ من شان حضرۃ الربوبیۃ) اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں:۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ

اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

مگر وہ راہ کس طرف لیجانا چاہتی ہے

پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیے صرف اُس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔

۱۔ اسلام کا اساس اولیں اصول توحید ہے، وہ سکھلاتا ہے کہ صرف خدا کو مانو اور صرف خدا کے آگے جھکو، اُسی سے مدد مانگنی چاہیے اور اسی کی اعانت پر اعتماد کرنا چاہیے (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) جس طرح خدا کی ذات کو ایک ماننا توحید میں داخل ہے اسی طرح اس کی صفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرنا جزء توحید ہے۔ پس خدا کے سوا کوئی نہیں جس کا حکم انتہائی حکم ہو، کوئی نہیں جو عاجزی و تذلل کا مستحق ہو، کوئی نہیں جس کی جبروت وعظمت کے آگے چون وچرا کی گنجائش نہ ہو، اور کوئی نہیں جو ڈرنے اور خوف کرنے کے لائق ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیر الامم بنایا اور دنیا میں اپنی نیابت اور خلافت بخشی، پس اپنے درجہ کو ہر مسلمان محسوس کرے اور افسردگی، بے ہمتی، خوف و مرعوبیت کی جگہ اپنے اندر بلندی، خودداری، طاقت اور استحکام پیدا کرے۔

۳۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک عادلانہ قوت قرار دیا اور فرمایا کہ "جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" ان کا ہر کام عدل و اعتدال پر مبنی ہوگا، پس مسلمانوں کو ہر موقعہ پر میانہ روی اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ہم مسلمان دنیا میں صلح و امن کا پیام ہیں، انہوں نے تلوار بھی اٹھائی ہے تو صلح کی حمایت میں، پس فتنہ و فساد اگر اوروں کے لیے معیوب و جُرم ہے تو اُن کے لیے تو معصیت اور فسق ہے۔ دنیا میں جن قوموں نے فتنہ و فساد اختیار کیا وہ قہرِ الٰہی سے مغضوب و مردود ہو گئے۔

۵۔ قرآن ان کو سکھاتا ہے کہ :۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ — ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں کے لیے، گناہ اور فساد کے لیے نہیں۔

وہ دنیا میں خدا کے پاس اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ نیکی کی حفاظت کریں اور فساد کو روکیں، پس ہر اچھی بات کرنے والوں کے وہ مددگار ہوں خواہ وہ گورنمنٹ ہو یا کوئی اور قوم۔

۶۔ قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استبداد و اقتدار کی مخالفت کرے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جو انسانوں کو محض اپنی رائے اور خواہش کے بنائے ہوئے احکام کی تعمیل پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ	یہ حق کسی بشر کو نہیں پہنچتا کہ اللہ تعالیٰ
اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	اسے کتاب اور عقل اور حکم اور نبوت
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا	عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ
عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو۔

(۳ : ۷۹)

جس چیز کا اختیار انبیاء کرام کو نہیں اس کا حق کسی دنیوی طاقت و حکومت کو بھی نہیں مل سکتا۔ البتہ وہ ملت اور جماعت کے اندر اپنی عقل کو مخفی بتلاتا ہے اور کہتا ہے (یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ) "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے" پس اس کے نزدیک وہی حکومت جائز ہوسکتی ہے جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو، اسی بنا پر اس نے مشورے کا حکم دیا ہے۔

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۔ اور ان کو حکم دیا کہ آپس میں مشورہ کرکے تمام کام انجام دیں نیز پیغمبر تمام امور و معاملات کو مشورے کے ساتھ انجام دیا کرو۔

پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انہیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں۔

یہ اصول ہیں جن سے ہم اپنی پولیٹیکل پالیسی تیار کرسکتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی کاسہ لیسی کی ضرورت ہے نہ اکسٹریمیٹ کی۔ اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند مگر بے خوف جماعت ہونگے اور ہم سے کسی فریق کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہوگا۔ ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے سعی کرینگے لیکن ہماری سعی فتنہ، فساد اور شورش و بغاوت سے بالکل پاک ہوگی۔ قرآن نے ہم کو سکھلایا ہے (لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا) امن کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہے اور اس امن میں ہم آزادی کے ساتھ

اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں پس اب باغیانہ شر و فساد اور مغویانہ قانون شکنی صلاح کے بعد زمین کو آلودۂ فساد کرنا ہوگا، اور یہ یقیناً خدا کا جرم اور عصیان ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ پس جو لوگ ملک میں فساد پھیلاتے ہوں خواہ وہ ہندو انارکسٹ ہوں یا جرائم پیشہ جماعتیں ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ان سے دوری ڈھونڈیں اور بن پڑے تو ان کے دفعیے کے لیے کوشش کریں۔

گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لیے مفید ہونگے اتنا ہی گورنمنٹ کے لیے، نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لیے۔ اس کو بھولنا نہ چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا۔ البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی، اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اسی میں یقین کرتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور یورپ خود اسی اصول پر کاربند ہوکر آزاد ہو چکا ہے۔ ہم انگلستان سے آج اسی چیز کے طالب ہیں جس شے کے لیے وہ خود کل تک بے قرار تھا۔ بے شک اگر اسلام کی بتلائی ہوئی پالیٹکس کی راہ ہمارے سامنے ہوگی تو ہم ایک طاقتور گروہ ہونگے، بے خوف ہونگے، اظہارِ حق میں بیباک ہونگے، کیونکہ ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن اسلام ہی کے بتلائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے قانون اور حکومت بھی ہماری طرف

سے بے خطر ہوگی۔ چونکہ ہماری راہ صاف اور غیر مشتبہ ہوگی اس لیے ہماری نیت اور ہماری زبان بھی ایک ہوگی۔ ہم جوش میں بھی آئینگے لیکن ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر ہوگا کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ فساد مت کرو۔ اب تک مسلمانوں کے جو پیشرو قوم کو چپ اور غافل رکھنے کی سعی کرتے رہے وہ اندر ہی اندر پھوڑے کو پکاتا اور راکھ کے اندر چنگاریوں کو دبانا چاہتے تھے لیکن اگر ہم اس راہ پر آئے تو ہمارے زخم دل پر نہیں بلکہ کھلے ہوئے چہروں پر ہونگے، ہماری خواہشوں اور شکایتوں کے پھوڑے اندر ہی اندر امن کے جسم کو نقصان نہیں پہنچائینگے، بلکہ پھوٹ کر بہہ جائینگے۔ ہم شور ضرور مچائینگے مگر پھر دل میں کچھ باقی نہ رہیگا، فریاد ضرور کرینگے مگر اندر شکایتوں کی آگ کو نہیں پالینگے پس گورنمنٹ کی بھی مصلحت یہی ہے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دے، کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لیے، نیز تمام عالم کے لیے یکساں طور پر مفید ہستی ہو سکتے ہیں۔

یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ یہی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع تقلید ہے بلکہ اُس رب العالمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے سامنے کھول دی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اُس کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوت حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ، نہ صلہ کی توقع نہ داد کی اُمید، اس راہ کے داعی کریم کو جو حکم دیا گیا تھا وہ ہمارے سامنے موجود ہے:-

فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ

(اے پیغمبر) تو اُن کو دعوت دے اور جو حکم دیا گیا ہے اُس پر قائم ہو جا، اُنکی خواہشوں پر نہ چل اور اُن کو کہدے کہ تمام اُتری ہوئی کتابوں پر میرا ایمان ہے اور مجھ کو حکم ملا ہے کہ عدل کروں۔ وہی اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے، ہمارا عمل ہمارے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے۔ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اللہ نے ہم سب کو ایک جا جمع کر دیا اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

مسلم لیگ مسلمانوں کی پولیٹیکل راہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اُس کو یہی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

صبحِ اُمید

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بردارد

نزولِ رحمتِ الٰہی و حیات بعد الممات

قدرتِ الٰہی کی بخشائشوں کو کون شمار کر سکتا ہے:-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (۱۶:۳۴)
اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کبھی نہ کر سکو گے۔

عالم کائنات کی کونسی شے ہے جو اپنے اندر قدرت الٰہی کی کوئی نشانی نہ رکھتی ہو؟

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ۔
اور آسمان و زمین میں اسکی قدرت و عظمت کی کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے غافل انسان گذر جاتا ہے اور غور نہیں کرتا

لیکن عالم مادی کے آثار و آیات میں ایک بہت بڑی نشانی بارش کا نزول اور زمین کی نباتاتی حیات و ممات ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُہٗ فِی السَّمَآءِ
اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادلوں کو ان کی جگہ سے ابھارتی ہیں، پھر خدا

كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔

جس طرح چاہتا ہے اُن سے کام لیتا ہے، کبھی بادلوں کو آسمان پر پھیلا دیتا ہے کبھی اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ گویا ان کے بیچ سے مینہ نکلا چلا آتا ہے۔ پھر جب خدا اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اُسے برسا دیتا ہے تو وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

اس عالم حیات کی ساری زندگی پانی کے وجود سے ہے

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔

اور ہم نے دنیا کی ہر چیز میں پانی سے زندگی اور زندگی کی شادابی رکھی۔

جب زمین آفتاب کے آتشکدۂ حرارت سے قریب ہو جاتی ہے، اس کی شعلہ باریوں سے سطح زمین کا ذرہ ذرہ تپنے لگتا ہے، زندگی کی تمام علامتیں مفقود ہو جاتی ہیں، ہر شے پر مردنی، اور ہر چہرہ پر افسردگی چھا جاتی ہے، دریا اُتر جاتے ہیں ندیاں خشک ہو جاتی ہیں، زمین کے اندر کا خزانہ رطوبت بھی خالی ہو جاتا ہے، اور سبزہ و گل کی تر و تازگی اور کھیتوں کی شادابی دونوں خشک سالی کی تیغ سے ہلاک ہو جاتی ہیں، تو اُس وقت زمین اور زمین پر بسنے والی ہر نباتی اور حیوانی رُوح پانی کے لیے بیقرار ہوتی ہے، اور کوئی آنکھ نہیں ہوتی جو آسمان کی طرف اُمید سے نہ اُٹھتی ہو اور پھر مایوس ہو کر العطش! العطش! نہ پکارتی ہو، لیکن جب مایوسی انتہا درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور اُمید کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا تو پھر یکایک عالم ساوی میں ایک انقلاب عظیم نمودار ہوتا ہے اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج صدائے اُمید

بن کر دنیا میں پھیل جاتی ہے:-

فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۰: ۵۰)

پس رحمت الٰہی کی ان نشانیوں کو دیکھو کہ کیونکر وہ زمین کو موت کے بعد دوبارہ حیات بخشتا ہے؟ بے شک وہ مردوں کو جلانے والا ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔

اخلاقی و قلبی حیات و ممات

انسانی قلوب کی حیات و ممات اور قوموں کی اخلاقی زندگی اور موت کا بھی یہی حال ہے۔ مایوسیاں جب حد درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، اور انسانی سعی اُمید کی کوئی راہ اپنے سامنے نہیں دیکھتی تو وہ خدا جو انسان کی جسمانی زندگی کے لیے اپنے آسمان کو حکم دیتا ہے کہ بارانِ رحمت کا دروازہ کھول دے، ضرور ہے کہ انسان کی قلبی زندگی کے لیے بھی اپنے ملائکہ رحمت کو بھیج دے تاکہ پیغامِ اُمید سے مُردہ دلوں میں زندگی کی حرکت پیدا کر دیں۔

صبحِ اُمید

گذشتہ چند سالوں سے تمام عالمِ اسلامی میں ایک اخلاقی بیداری کے جو آثار نمایاں ہو رہے ہیں، وہ اُمید دلاتے ہیں کہ شاید ہماری مایوسیوں کی انتہا سے اُمید کا آغاز شروع ہو، لیکن آج ہم صرف مسلمانانِ ہند کے موجودہ حالات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہم نے ابتدائے اشاعت سے الہلال میں مسلمانوں کی گذشتہ اور موجودہ

حالت پر مرثیہ خوانی کی ہے اور ان کے اعمال زندگی کی ہر شاخ کو مایوسی کی نظر سے دیکھا ہے لیکن حضرت یعقوب نے اپنے لڑکوں کو نصیحت کی تھی "لَا تَایْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ" اللہ کی روح رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اور اسلام پہلی چیز جو اپنے پیرو کو بخشتا ہے وہ اُمید ہی ہے

وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَۃِ رَبِّہٖ — اور اللہ کی رحمت فرمائی سے کافروں کے
اِلَّا الضَّآلُّوْنَ — کے سوا اور کون نا اُمید ہو سکتا ہے؟

نو امید مشو، کہ نا اُمیدی کفر است

دیکھتے ہیں، تو باوجود اس ہمہ اسباب مایوسی، پھر بھی اُمید نے ہمیں بالکل چھوڑ نہیں دیا ہے، اور ہندوستان میں جو تغیرات و انقلابات پچھلے دنوں کے اندر ظاہر ہوئے ہیں اُنھوں نے مسلمانوں کے موجودہ حالات میں اُمید کی ایک جھلک نمایاں کردی ہے۔ گو بارش کے برسنے میں دیر ہو مگر موسم آثار و علائم سے خالی نہیں۔

بیداری کی ایک کروٹ

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کی محتاج ہوتی ہیں، اور ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے، جو گو زندہ ہے مگر حرکت کرنے کے لیے کسی بیدار کن صدا کا محتاج ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام نشو و ارتقا کی قوتیں ابتداء سے وقف غفلت رہیں ان کو کوئی جگانے والا ہاتھ اور کوئی ہشیار کرنے والی صدا نصیب نہیں ہوئی۔ قوموں کی زندگی کی اصلی قوت عوام کا طبقہ ہے مگر اس طبقہ کی قوت چند نفوس خاص کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ان کی بیداری سے تمام ملت بیدار رہتی ہے اور ان کی غفلت سے تمام ملت پر

غفلت چھا جاتی ہے، لیکن بدبختی سے مسلمانوں کے رہنماؤں کا یہ حال رہا ہے کہ:۔

اوخویشتن گم است، کرا رہبری کند

خدا کی بخشائش عام ہے۔ فطرت کی فیاضیوں میں نسل وقوم کی تمیز نہیں اور اُن کے جسم کے اندر جو خون ہے وہی ہماری رگوں کے اندر بھی دوڑ رہا ہے۔ ہندستان میں گزشتہ نصف صدی کے اندر بیسیوں تغیرات ہوئے۔ تعلیمی رفتار کو خواہ کتنا ہی سُست کہا جائے، مگر ترقی رفتار سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی چیز شب وروز کے ساتھیوں کی حرکت تھی اور کوئی نظر ایسی نہ تھی جس کے سامنے سے قافلے نہ گزرتے ہوں اور شہسواروں کی اڑائی ہوئی گرد سے غبار آلود نہ ہوتی ہو۔ ضرور تھا غافل دلوں میں اُمنگ اور حرکت کی گدگدی پیدا ہوتی اور ساتھیوں کو دوڑتے دیکھ کر بلا قصد بھی پاؤں حرکت کرنے لگتے، مگر بدبختی یہ تھی کہ لگام اُن ہاتھوں میں تھی جو لگام سے لگام کا نہیں بلکہ زنجیر کا کام لیتے تھے، اور بیداری کے قدرتی ولولوں اور امنگوں کو ہمیشہ اپنی مصنوعی خوابِ مقناطیسی کے عمل سے دبا دینا چاہتے تھے۔ دلوں میں جوش اُٹھتا تھا، اور آنکھیں راہِ مقصود کو ڈھونڈھتی بھی تھیں لیکن جوش یا تو دبا دیا جاتا تھا، یا اُس کے لیے ایک غلط مصرف پیدا کر دیا جاتا تھا، جس میں خرچ ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔ اور تلاشِ راہ کی خواہش کو یا تو بڑھنے سے روک دیا جاتا تھا یا پھر ایک پُرپیچ وخم راہ ضلالت سامنے کر دی جاتی تھی، تاکہ جستجوئے منزل کا قدم اسی میں بھٹک کر رہ جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ:۔ اس کی کتنی صاف اور بین مثال ہمارے سامنے

ہے! مسلمانوں کی افسردگی اور بے ہمتی کے افسانے نصف صدی سے ہماری انجمنوں کا دائمی مرثیہ ہیں، لیکن مسلم یونیورسٹی کی صدائے تحریک کے بلند ہوتے ہی تمام ملک میں ایک عام جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ ملک کا کوئی حصہ اور قوم کا کوئی طبقہ نہیں، جس کے اندر اس صدا نے حرکت پیدا نہ کردی ہو، علی الخصوص صوبجات متحدہ اور پنجاب میں نوجوان نثارانہ فداکاریوں کے ولولے نظر آنے لگے، اور بازار کے دوکاندار اور دیہاتوں کے کاشتکار تک پوری دلچسپی اور شغف کے ساتھ اس کے چندے میں شریک ہوئے۔ غور کیجیے کہ یہ کیا بات تھی؟ بار بار کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی عام تعلیمی خواہش اور جستجو کا یہ نتیجہ تھا، لیکن اس سے بڑھ کر اور کوئی غلط بیان نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں نے لاہور میں یونیورسٹی ڈیپوٹیشن کی گاڑیاں کھینچی ہیں، راہ میں جلوس کو روک کر شربت کے گلاس تقسیم کیے ہیں اور کوٹھوں اور برآمدوں پر سے پھولوں کے گلدستے پھینکے ہیں اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ قصبوں اور دیہاتوں میں جن لوگوں نے سیکڑوں روپیوں کی رقمیں چندے میں شامل کی ہیں، ہمیں بتایا جائے کہ ان میں کتنے آدمی تھے جو یونیورسٹی کی ضرورت کو محسوس کرنا ایک طرف اس کی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتے تھے؟

اصل یہ ہے کہ یہ تمام جوش و ہنگامہ اس امر کا ایک بیّن ثبوت تھا کہ لوگ سوتے سوتے اب تھک گئے ہیں۔ اور قلوب حرکت اور رجد و جہد کے قدرتی ولولوں کو اور زیادہ نہیں روک سکتے۔ طبیعتوں میں جوش بیقراری پیدا کر دیا ہے۔ قوتیں ابھرنے کے لیے بیچین ہیں، اور جذبات مضطرب ہیں کہ باہر سے کوئی صدا سنیں، تو لبیک کہہ کر

اُٹھ کھڑے ہوں۔ یونیورسٹی کی صدا غیر معمولی بلند آہنگی سے بلند ہوئی، تو جوش و قوت کا سیلاب اسی رُخ بہنے لگا۔ پاؤں چلنے کے لیے بیقرار تھے، جو راہ سامنے نظر آگئی، اُسی پر دوڑنے لگے۔ یہ کام کرنے والوں کا کام تھا کہ طاقتوں اور اُمنگوں کے لیے ایک صحیح مصرف تجویز کرتے اور انجن کو پٹڑی کی لائن پر چلاتے۔ اس کی اسٹیم کو جنگل میں دوڑا کر ضائع نہ کر دیتے، لیکن وہ روز اول سے اس کوشش میں معین ہونے کی غلطی کر رہے ہیں کہ یا تو قدرتی ولولوں کو دبایا جاتا ہے اور یا پھر ایک غلط راہ پر لگا کر راہ مقصود سے غافل کر دیا جاتا ہے۔

قدرتی ولولوں کو روکنا ممکن نہیں۔

لیکن تاہم دل کے جوش اور ولولے کو باہر کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ قدرتی نشو ونما کو کتنا ہی روکیے، وہ ابھر ہی کر رہیگا۔ آپ نے بارہا اپنے دروازے کے آگے کسی بے موقعہ درخت کے پودے کو بڑھتے دیکھ کر کچل دیا ہوگا، اگر چند دنوں کے بعد پھر دیکھا ہوگا تو اُس کی جگہ خالی نہ ہوگی۔ یہ قدرت کے کاروبار ہیں اور ان میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ مسلمانوں کے دلوں کو برسوں تک زمانے کی آوازوں سے غافل رکھا گیا، لیکن یہ ایک زبردستی کی پٹی تھی جو اُن کی آنکھوں پر باندھی گئی۔ ممکن تھا کہ ابھی کچھ اور زمانہ غفلتوں اور گمراہیوں کو فرصت کامل جاتا، لیکن ہم نے جاگنے میں دیر کی تھی، تو قدرت نے جگانے میں اور زیادہ دیر نہ کی۔ یکے بعد دیگرے چند واقعات و تغیرات نے بھی ظہور کر کے تنبہ اور غفلت شکنی میں مدد دی اور الحمد للہ کہ اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں تو مایوسی کی جگہ اُمید کے اثر کو غالب پاتے ہیں، تو اب تک کوئی اصلی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

نہ تو پچھلی راہ سے پورے قدم ہٹے ہیں اور نہ آئندہ کے لیے کوئی نئی راہ متعین ہوئی ہے۔ اب تک جو کچھ تغیرات ہوئے ہیں، صرف ذہن و دماغ تک محدود ہیں اور وہ بھی کوئی کامل تغیر نہیں، بلکہ صرف ایک جنبش ہے جو دماغوں کے جمود نے محسوس کی ہے۔ پھر جو کچھ بھی ہے کسی متحد رشتے میں منسلک نہیں اور اب تک اتحاد و مبادلۂ آراء کی قوت سے محروم ہے۔ تاہم ہر حرکت کی ابتدا جنبش سے اور ہر عمل کا آغاز ذہن و خیال سے ہوتا ہے۔ برسوں کی نیند کے متوالے اگر ابھی کروٹ بھی لے رہے ہیں تو اٹھ کر بیٹھ جانے کے لیے جلدی نہ کرنی چاہیے۔ شب کی سرمستیوں کا ابھی کچھ عرصہ تک تو خمار رہے ہی گا۔ عجب نہیں کہ نئے موسم کے آنے تک کچھ زمانہ تداخل کی بے نوائیوں کا بھی گزرے، لیکن ہر حال میں عقل و ہوشمندی، حزم و احتیاط اور اعتدال و توسط کے ساتھ نظر عواقب امور پر رہنی چاہیے۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ (۲۸:۴۲)

انسان کی ضلالت کا اصلی مبدا

ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لیے پہلی منزل "تقلید" کی بندشوں کو توڑنا ہے، کیونکہ تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں، اُن سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے۔ اس لیے راہِ اصلاح کا اولین منظریہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسانوں کو نجات حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا، اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے؛

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰ : ۸)

کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لیے دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور بولنے کے لیے زبان اور لبیں نہیں عطا کیں؟ اور پھر ہدایت و ضلالت کی دونوں راہیں اس کے سامنے نہیں کھول دیں؟

اس لیے ہر انسان اپنی ہدایت و گمراہی کا ذمہ دار، اور اپنے فکر و دماغ سے کام لینے کے لیے خود مختار ہے۔ لیکن انسان کی تمام قوتیں نشو و نما کی محتاج ہیں اور نشو و نما ہو نہیں سکتی، جب تک قوتوں کو بغیر کسی سہارے کے خود ورزش کرنے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے۔ انسان چلنے کی قوت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے، مگر بچے کو جب تک خود کھڑا ہونے اور پاؤں پر زور دینے کے لیے چھوڑ نہ دیجیے گا کبھی اُس کے پاؤں نہیں کھلینگے۔ تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے، وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آبا و اجداد کے طریق و رسوم پر اپنے تئیں چھوڑ دیتا ہے، اور صرف اُنھی کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اُس کی حالت بالکل ایک چارپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و تعقل کی تمام علامتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصل شرف نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکر اور اجتہاد و تجسس ہے۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانینِ الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اُٹھے، اشیائے کائنات کے خواص کا جو کچھ سُراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے غرض کہ انسان کے

ارتقائے ذہنی وفکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آرہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں، لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے، جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی سد باب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے۔ بت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباء و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن نے اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا؟	کیا لوگ اپنے دماغ سے قرآن پر غور نہیں کرتے، یا اُن کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔

مقلدین محض کو چارپایوں اور حیوانوں سے تشبیہ دی، اور پھر اس کو بھی اظہار ضلالت کے لیے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر فرمایا:۔

لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ	اُن کے پاس دل و دماغ ہیں مگر نہیں سمجھتے، آنکھیں ہیں پر نہیں دیکھتے، کان ہیں مگر نہیں سنتے، خود اپنے ذہن سے کام نہ لینے اور مقلد محض ہونے میں وہ مثل چارپایوں کے ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔

پس خواہ مذہبی اصلاح ہو یا اخلاقی، تمدنی ہو یا سیاسی، ہر راہ میں پہلا پتھر تقلید کا حائل ہوتا ہے، اور اگر یہ ہٹ جائے تو پھر آگے کے لیے راہ صاف ہے۔ ہم کو

مسلمانوں کے موجودہ سیاسی تغیرات میں سب سے پہلی علامت اُمید جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس راہ میں لیڈروں کی تقلید و اتباع کی جو بیڑیاں برسوں سے قوم کے پاؤں میں پڑی تھیں، الحمد للہ کہ اُن کو توڑ کر پھینک دینے کے لیے ہر پاؤں بے قرار ہے، اور اب اور زیادہ اس بوجھ کو برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ اب تک فی الحقیقۃ پالیٹکس میں تو قوم کی کوئی پالیسی تھی اور نہ کوئی رائے، صرف چند اربابِ رسوخ و اقتدار تھے جو اپنے محلوں میں بیٹھ کر تجویز بافی کر لیا کرتے تھے اور پھر تمام قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُن کے ہاتھوں میں اپنی چھڑی پکڑا دیتے تھے، اور وہ کولہو کے بیل کی طرح ان کے بنائے ہوئے مرکزِ ضلالت کا طواف کرتی رہتی تھی۔ اصل قوت عام قوم کی ہے، اور سچی پالیسی وہی ہے جو خود قوم کے دماغوں میں پیدا ہوئی ہو۔ لیڈروں کا کام یہ ہونا ہے کہ اُس کی نگہداشت کریں اور اس کو ایک صحیح اور باقاعدہ تنظیم کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھیں۔ مسلمان لیڈروں نے نہ تو کبھی خود قوم کو سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ دیا اور نہ خود قوم کو اپنے ذاتی اجتہادِ فکری اور قوتِ تفکر و تدبر سے کام لینے کی مہلت ملی۔ ابتدا سے لیڈروں کی یہی تعلیم رہی کہ تقلید و اتباع پر قناعت کرو اور جو کچھ کہا جائے اُس پر چون و چرا مت کرو، کیونکہ ابھی تم میں تعلیم نہیں، اور کئی صدیوں تک چارپایوں کی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور رہو گو یا نعوذ باللہ پیشوایانِ قوم کا صحیفۂ تعلیم بھی کلامِ الٰہی تھا کہ:-

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ — جب قرآن کریم پڑھا جائے تو پوری توجہ اور انقطاع کے ساتھ سُنو اور

تُرْحَمُوْنَ ○ (۷: ۲۰۳) اور چپ رہو تاکہ تم پر اللہ کی نظر ترحم مبذول ہو۔

ہمارے سلف صالحین کی تو تعلیم تھی کہ اللہ پر توکل کرو اور مقام تفویض حاصل کرو لیکن لیڈروں کی تعلیم یہ تھی کہ گورنمنٹ پر توکل و تفویض کی عادت ڈالو کہ وہی کارساز حقیقی اور مجیب الدعوات و قاضی الحاجات ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اور انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اوروں کو اپنا
اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا	معبود بنا رکھا ہے تاکہ ان کے لیے عزت ہو
كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ	لیکن یہ تو کبھی ہونے کا نہیں، عزت کی جگہ
وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا	معبود ان کی بندگی سے انکار کریں گے اور
(۱۹: ۸۴)	الٹے ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں، اور قوم ان احکام کی تعمیل کرتے کرتے اکتا گئی ہے یہ پہلا موقعہ ہے کہ عوام نے اپنی قوت کو محسوس کیا ہے اور لیڈروں کی تقلید محض کی جگہ خود اپنے دماغ اور فکر سے اپنے مصالح پر غور کرنا چاہا ہے پس فی الحقیقت یہ قومی زندگی کے لیے سب سے بڑی بشارت اور روح ملی کا پیغام حیات ہے اور ہم اس کو کوئی معمولی حرکت نہیں سمجھتے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی اور مسئلہ الحاق علیگڈھ

بلکہ اگر مذہب امید کی تعلیمات کو زیادہ کشادہ دلی کے ساتھ قبول کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جتنے قلیل عرصے کے اندر خیالات میں تغیر کی روشنی پیدا ہوئی ہے وہ گذشتہ تاریکی کو دیکھتے ہوئے تعجب انگیز ہے یا تو لوگوں کا یہ حال تھا کہ لیڈروں کے ہر حکم کے آگے سمعنا و اطعنا کہتے ہوئے سر بسجود

ہو جاتے تھے یا یکایک دلوں کی کل اس طرح بگڑ گئی کہ ہز ہائی نس سر آغا خاں
ڈھاکہ یونیورسٹی کو تقسیم بنگال کا نعم البدل قرار دے کر حکم دیتے ہیں کہ "تنسیخ
تقسیم پر اظہار ناراضی کی جگہ گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرو"۔ اور لیگ کے دفتر میں
جلسہ منعقد کیا جاتا ہے، لیکن نہ تو کوئی بندۂ خدا مولوی عزیز مرزا مرحوم کی
سنتا ہے اور نہ اس فرمان عالی کی تعمیل کے لیے آمادہ ہوتا ہے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی ناپسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹی کے الحاق کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ فی نفسہ
خواہ اہم ہو یا نہ ہو لیکن قوم کی خواہشوں کے ضرور خلاف تھا۔ اگر پچھلے
وقتوں کی صحبتیں ہوتیں، تو لوگ غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے لیکن
پریس کمیونک کی اشاعت کے ساتھ ہی تمام ملک میں ایک عام جنبش
پیدا ہوگئی اور لیڈروں نے قوم کو اس قدر محکم دیکھا کہ قوم کو اپنے آگے جھکانے
کی جگہ پہلی مرتبہ خود اس کے آگے جھک گئے۔ یہ حالات یقیناً مایوسیوں
کی شب تاریک میں ایک "صبح امید" کی آمد کے آثار ہیں۔ پہلی شے یہی تھی
کہ تقلید کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پاؤں خود چلنے کے لیے حرکت کریں،
الحمد للہ کہ اس اولین منزل کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔

(۲)

کسیکہ محرم راز صباست، می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

دوسری علامت: رہبانی اقتدار کا خاتمہ

ایک بہت بڑی اُمید افزا علامت یہ بھی ہے کہ ہمارے لیڈروں کی اُس اجباری اور رُہبانی سطوت و تسلط کا خاتمہ ہوگیا، جس نے قوم کے قلوب و اذہان کی ذاتی قوت سلب کر دی تھی، اور کسی متنفس کو اس کے آگے چون و چرا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کے پُرخوف رعب کا کسی ایک گروہ کے قبضے میں رہنا، ہمیشہ سے قوموں کے دماغی تنزل کی ایک حقیقی علت رہا ہے، اور تقلید کی جس قدر گمراہیاں ہیں، وہ اسی رعب و جبروت کی ہوا میں نشو و نما پاتی ہیں۔ ہم نے گذشتہ نمبر میں کہا تھا کہ ہر اصلاح کی اولین منزل تقلیدی بندشوں سے رہائی ہے، لیکن تقلید کے قید خانے سے آدمی نکل نہیں سکتا، جب تک پیشواؤں کے رعب و جبروت کی زنجیروں سے رہائی نہ پائے۔ انسان کے نظام دماغی پر صرف اعتقادات کی حکومت ہے، اس کے تمام حاسّے اسی شے کے ماتحت، اور تمام اعمال و افعال اسی سے وابستہ ہیں، پس جب اس کا دماغ کسی خارجی عظمت و جبروت کے اثر سے مرعوب ہو جاتا ہے، تو اس کے تمام اعمال و معتقدات میں اس مرعوبیت کا اثر سرایت کر جاتا ہے، بلکہ وہ جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، وہ بھی اس مرعوبیت کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کی قوت فکری بیکار ہو جاتی ہے، اس لیے یہ مرعوبیت جو کچھ دکھاتی ہے، دیکھتا ہے، اور جو یقین دلاتی ہے، یقین کرتا ہے۔

ایک بت پرست جب انتہا درجہ کی عاجزی کے ساتھ ایک پتھر کی مورت کے آگے سر ٹیکتا ہے، تو کیا اُس کا دماغ مختل ہو جاتا ہے؟ کیا اس کی قوت بصارت جواب دیتی ہے؟ کیا سوچنے اور سمجھنے والی قوت اس کے دماغ سے اُس وقت چھین لی جاتی ہے؟ اور

کیا کوئی خاص قوت تفکر موحد و الٰہ پرست انسان کو نصیب ہے، جو بت پرستوں کو نصیب نہیں؟ پھر کیا بات ہے کہ ہم کو جو شے محض پتھر کا ایک ٹکڑا نظر آتی ہے: مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ. اسی شے میں بت پرست الٰہی طاقتوں اور عظمتوں کا کرشمہ دیکھتا ہے، اور جو قوت فکری ہمیں اس پر ہنساتی ہے، وہی اس کی طاقتوں کا اسے یقین دلاتی ہے!

اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ تقلید آبا و رسوم نے ان بتوں کی عظمت و جبروت سے اس کے دماغ کو مرعوب کر دیا ہے، اور تمام قوتیں اور حواس گو قائم و صحیح ہیں، مگر اس رعب و سطوت کے بوجھ سے اس طرح دب گئی ہیں، کہ ان کو اپنے اعمال کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ قوت فکری ضرور اس کے دل میں شک اور تزلزل پیدا کرے کہ ان بتوں میں دھرا ہی کیا ہے؟ مگر مرعوبیت اس کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ آنکھیں ضرور اس کو دکھلائیں کہ یہ ایک حقیر و ذلیل پتھر ہے، مگر مرعوبیت کی بندھی ہوئی پٹی دیکھنے ہی نہیں دیتی۔ اس کے پاس غور اور فکر کی وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو ایک موحد اور "ملکوت السماوات والارض" پر غور کرنے والے حکیم کے پاس ہیں، مگر اعتقاد و عظمت کا دیو انہیں اپنے پنجے کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا۔ قرآن کریم نے اسی حالت کی نسبت فرمایا ہے کہ:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ	گمراہوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں،
وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي	بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں، جو ان کے
فِي الصُّدُورِ (۲۲: ۴۵)	سینوں میں ہیں۔

یہ حالت عام ہے اور اس کی نظیریں انسانی اعمال کی ہر شاخ میں مل سکتی ہیں۔ کہ طرح الشک ... ہم بھی مسلمان ... اپنے پیشواؤں کی عظمت و جبروت کا رعب

اس طرح چھایا ہوا تھا کہ ان کو کبھی خود غور کرنے اور اپنی حالت کو سمجھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کبھی کسی شخص کے دل میں شک و شبہ پیدا بھی ہوتا تھا، تو اس مرعوبیت کے استیلا سے شکست کھا جاتا تھا۔ مگر الحمد للہ کہ اب تقلید کی بندشوں کی شکست نے اس الہی رعب و سطوت کی زنجیروں سے بھی مسلمانوں کے دماغوں کو نجات دلا دی ہے، اور ہماری نظر میں یہ اصلاح و تغیر کی دوسری بنیاد ہے، جس کو ہر طرح کے اصلاحی تغیرات کا دیباچہ سمجھنا چاہیے۔ یہ کوئی معمولی انقلاب نہیں ہے کہ کل تک جن لیڈروں کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا، سب سے بڑا انسانی جرم سمجھا جاتا تھا، آج تمام قوم علانیہ اخبارات میں ان پر سخت سے سخت نکتہ چینیاں کر رہی ہے اور شدید سے شدید الزام دینے میں بھی کوئی گناہ نہیں سمجھتی۔ اب لیڈروں کی بنائی ہوئی سیاسی شریعت کے احکام میں عقل کو دخل دینا کفر نہیں رہا، بلکہ صرف بدعت ہے، اور بہتوں کے عقیدے میں تو بدعتِ حسنہ۔ اب آزادانہ حقوق طلبی اور پولیٹکل جدوجہد کی دعوت دینے والے کو گزشتہ سیاسی اصطلاح کی سب سے بڑی گالی دینے، یعنی "کانگریسی" کہنے میں جلدی نہیں کی جاتی، حالانکہ یہ وہ گالی تھی، جس میں گویا اخلاقی، تمدنی، اور مذہبی رذائل و عیوب کی ایک دنیا پوشیدہ تھی۔ غرضکہ اب مسلمان لیڈروں اور اُن کی "مسلمہ پالیسی" کی عظمت و رعب کا بیتِ عنکبوت ہباءً منثورا ہو گیا: وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون (۲۹ : ۴۱) نعرۂ انا الحق کہنے پر منصور کو سولی پر چڑھایا جاتا تھا، اب بہت سے منصور پیدا ہو گئے ہیں جو دار و رسن کی سطوت سے بے خوف و نڈر ہیں، اور خود لیڈروں نے بھی اس تغیر کی قوت کو محسوس کر کے اپنے اقتدار رفتہ کو

اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطَانٍ" کی گرفت ڈھیلی کردی ہے، بلکہ زیادہ غور کے ساتھ دیکھا جائے تو لیڈروں کے رعب و سطوت کی جگہ اب خود لیڈر قوم کے رعب سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس تغیر کی فرصت کو ضائع نہ کردیا گیا تو انشاء اللہ بہت جلد قوم میں زندگی کی حرکت پیدا ہونے والی ہے "یحق اللّٰہ الحق بکلمتہ ولو کرہ المجرمون" (اور خدا اپنے کلام سے حق بات کو حق کر دکھائیگا، اگرچہ منکروں کو برا لگے

اسلامی پریس کا تغیر

اگرچہ اس تغیرِ حالت کا اصلی سبب، قدرتی ولولوں کا اضطراب، اور پھر اس کا جلد ظہور، تنسیخ تقسیم بنگال کو سمجھنا چاہیے، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلامی پریس کے ایک دانشمند اور اثر پذیر حصے نے بھی اس تغیر کی تشکیل میں بہت مدد دی، اور یہ سخت ناانصافی ہوگی اگر اب، اور آئندہ بھی اس تغیر کے تذکرے میں ان کے ذکر کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں بلحاظ تقدیم اشاعت سب سے پہلے کامریڈ کا ذکر کرنا چاہیے جس نے گو قدیمی اصطلاحات و اسمار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی سعی لاحاصل کی (لاحاصل اس لیے کہ اب ان میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی) لیکن تاہم معانی بہت کچھ بدل دئیے، اور گو تغیر کی رفتار مصلحۃً سست رکھی، مگر پچھلی منزل سے آگے بڑھتا رہا، اور مسلمانوں میں بتدریج ملکی معاملات سے دلچسپی لینے کے مذاق اور ہر پولیٹیکل مسئلے میں لیڈروں کے فتوؤں کی جگہ قومی آراء کے ظہور و نشو و نما کا ایک موثر محرک ہوا۔ اصلاح و تغیر کے مختلف طرق میں سے یہ بھی ایک بے خطر اور آسان تر طریقہ ہے۔ کامریڈ کے ساتھ ہی مسلم گزٹ

لکھنؤ اور زمیندار لاہور کے نام نظر آتے ہیں، جن کی آزادانہ پالیسی کوفی الحقیقت اس نئی بیداری کے ظہور میں نمایاں دخل ہے۔ پرانے اخباروں میں وکیل امرتسر بھی قابل تذکرہ ہے، جس نے یونیورسٹی کے متعلق ابتدا سے آزادانہ رائیں ظاہر کیں۔ اسی سلسلے میں خاص طور پر البشیر کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس نے سچائی اور قابل تعریف دلیری سے نئے تغیرات کا ساتھ دیا ہے اور پچھلی پالیسی سے دست بردار ہو جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ یونیورسٹی کمیٹی کی نسبت بھی جو مضامین آج کل وہ لکھ رہا ہے، وہ آزادی اور راست بیانی سے خالی نہیں۔ اور گو وہ ہم "قدیمی دشمنانِ کالج" اور "اعدائے قوم" سے کتنا ہی ناراض ہو، مگر جب وہ اپنی جگہ چھوڑ کر حرکت کر چکا ہے، تو اب ہم کو اس سے کوئی ناراضگی نہیں، بلکہ خوش ہیں کہ

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

ان کے علاوہ اب تو عام طور پر اکثر معاصرین کو اس تغیر سے متاثر، اور راہ حق گوئی و آزادی کے قریب قریب پاتے ہیں۔ نئے نئے پرچے بھی جو نکل رہے ہیں، وہ بھی الحمد للہ نئے خیالات لے کر نکلتے ہیں اور پرانے طریق کو چھوڑ رہے ہیں۔ اکثر صاحبوں نے تو علانیہ نئے خیالات کا اظہار شروع کر دیا ہے اور بعض مصلحۃً صرف تغیر لب لہجہ سے نئی پالیسی کی ابتدا کرنی چاہتے ہیں اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ علی الخصوص یونیورسٹی کے معاملہ میں تو تقریباً تمام اسلامی پریس آزادانہ رویہ پر متحد ہو گیا ہے اور کوئی اخبار بھی ایسا نہیں، جس نے نہایت سخت لفظوں میں نکتہ چینی نہ کی ہو۔ شکر اللہ سعیھم و وفقنا اللہ سبحانہ وایاھم

کما یحب و یرضاہ۔

مسلم گزٹ لکھنؤ

مگر درحقیقت موجودہ تغیرات کے ذکر میں سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کا ذکر کرنا چاہیے، جس نے موجودہ سیاسی تغیراتِ خیالات کی تولید میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا، اور اس خدا پرستانہ دلیری، اور حق گویانہ آزادی کے ساتھ صدا بلند کی، کہ فی الحقیقت "لاتخافون لومۃ لائم" کے نفوس خاص ہیں اس کا شمار ہے۔ ہم اپنے مخدوم رصیف سے متمنی ہیں کہ اپنے قلمی جہاد کو اور زیادہ محکم و شدید کریں۔ اور آگے چل کر ہم جن امور کا ذکر کرنے والے ہیں اُن سے غفلت نہ فرمائیں، وہ یقین کریں کہ حق اور سچائی کے لیے فتح ہر باطل اور باطل پرستی کے لیے نہیں کہ ان الباطل کان زھوقا۔

موجودہ لیڈروں کے خیالات میں تغیر

اس سلسلے میں اُس تغیر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو آج کل خودکار فرمایانِ ملت کے خیالات میں بھی صاف صاف نظر آرہا ہے۔ اور اگر یہ تغیر محض مصالحِ وقت، اور اضطرارِ حالات کی بنا پر نہیں، بلکہ سچے طور پر دل اور دل کے اندر تک پہنچا ہوا ہے تو فی الحقیقت اس کو ایک بہت بڑی فال نیک سمجھنا چاہیے۔ ہم نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں سخت سے سخت الزام ان کو دیے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے ان کی نیتوں تک کو بھی مشتبہ قرار دیا ہے، مگر وہ یقین کریں کہ ہم اُن سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ ہمارے بعض دوستوں نے ہم کو الزام دیا ہے کہ ہم لیڈروں کی پوری جماعت کو یکساں تاریکی میں ظاہر کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں، ہمارا تو ان کی نسبت ابتدا سے یہ خیال ہے کہ:

مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ	بعض ان میں سے طریق ہدایت کو چھوڑ کر اپنے نفوس
وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ	پر ظلم کر رہے ہیں، بعض ان میں سے درمیانی راہ چلتے
وَمِنْهُمْ سَابِق	ہیں اور پھر انہی میں سے ایسے بھی ہیں، جو واقعی اعمال
بِالْخَيْرَات (۳۵: ۳۱)	نیک میں پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔

لیڈروں سے ہماری صرف یہ التجا ہے کہ وہ گذشتہ باتوں کو بھول جائیں تو ہم بھی بھول جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کو موجودہ تغیرات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور ان کو چاہیے کہ آئندہ کے لیے اپنا معاملہ اپنے خدا سے درست کرلیں، اور اپنی نیتوں اور ارادوں کو صرف رضائے الٰہی کے تابع کردیں۔ جس دن وہ ایسا کرلینگے پھر اُن سے بڑھ کر قوم کے لیے اور کوئی مفید وجود نہ ہوگا۔ یہ کیسی سخت غلطی ہے کہ خدا اُن کو دین اور دنیا، دونوں کی عزت دینا چاہتا ہے، مگر وہ بے ہمتی سے صرف دنیا کو پوجتے اور اُسی کے پیچھے سرگرداں ہیں؟

ومن کان یرید ثواب	جو شخص دنیا کی بہتری چاہتا ہے اُس سے کہہ دو
الدنیا فعند اللہ ثواب	کہ خدا کے پاس دنیا اور دین، دونوں کی بہتری ہے۔
الدنیا والآخرۃ (۴: ۱۳۴)	وہ دونوں کا کیوں نہیں طالب ہوتا؟
ومن کان یرید العزۃ، فللہ	اور جو عزت کا طلبگار ہے اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ
العزۃ جمیعا (۳۵: ۱۰)	عزت اللہ کے لیے اور اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن اس فرصت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

یہ حالات یقیناً اُمید افزا ہیں، اور تغیرات نے نئی بنیادیں رکھنی شروع کردی

ہیں، مگر اب سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اس انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور بکمال حزم و احتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو۔ اگر خدانخواستہ یہ فرصت محض اخبار کی قلم فرسائیوں اور ذہنی نقشہ آرائیوں میں ضائع کردی گئی، تو پھر یاد رہے کہ ہمارے لیے ہمیشہ ایک طلائی فرصت کے کھو دینے کا ماتم ہوگا۔ قدرت اپنی بخشائشوں میں جس قدر فیاض ہے، اتنی ہی غافلوں اور کافرانِ نعمت کی تعذیب میں شدید بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پھر ایک مدت تک کے لیے ہمارے دل ہم سے روٹھ جائیں، اور زمانہ ہماری ملی قوت کو محض ایک عارضی ہیجان سمجھ کر ہمیشہ کے لیے ناقابلِ التفات سمجھ لے۔ اس وقت تک مٹے قافلے کے ساز و سامان کی فراہمی کے لیے جتنی دوڑ دھوپ ہو چکی ہے، کافی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ الرحیل! الرحیل! کی صدا بلند کردی جائے، اور قافلہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جائے۔

فکرِ مستقبل

پس گذشتہ افسانہ کو ختم کر کے آئندہ کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ اب ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ پچھلی راہ صحیح نہ تھی، اور گو: مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَائَنَا الْاَوَّلِيْنَ کی صدائیں اب بھی کہیں کہیں سے آرہی ہیں، اور گو ایسے بھی ہیں، جو اب بھی زبان سے اپنی پچھلی ضلالت کا اقرار کرتے ہوئے شرماتے ہیں، لیکن اگر دلوں کو ٹٹولا جائے، تو کوئی بھی نہیں جو تزلزل اور جنبش محسوس نہ کرتا ہو۔ اس لیے اب تمام قوتِ غور و بحث اس میں صرف کرنی چاہیے کہ آئندہ کے لیے کونسی راہ اختیار کی جائے، اور اس کا نظام اور مقصد کیا ہوگا؟ جن لوگوں نے موجودہ تغیرات

کے پیدا کرنے میں سعی مشکور کی ہی، ان کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ ناکام نہیں رہے مگر ساتھ ہی اب ان کا یہ بھی فرض ہی کہ اگر ایک راہ سے اُن کو ہٹایا ہی تو دوسری راہ پر لگا بھی دیں۔ اگر اس وقت قوم کے آگے کوئی نئی راہ پیش نہ کی گئی، تو خوف ہی کہ کہیں بے خانماں ہو کر اور زیادہ بھٹک نہ جائے۔ بیشک اب تک قوم کے پاس کوئی محفوظ گھر تھا ہی نہیں، گھر اگر بنے گا، تو اب بنیگا، تاہم ایک گھرے ہوئے گڑھے میں تو ضرور پڑی تھی، جب اُس سے نکل آئی ہی، تو زیادہ دیر تک کھلی زمین پر آوارہ نہ رکھیے۔

ہم اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہر اصلاح و تغیر کے لیے اصلی کام جنبش کا پیدا کر دینا، اور گمراہی کے قفس کا دروازہ کھول دینا ہی۔ جب حرکت پیدا ہوگی اور قفس کی قید سے باہر نکلینگے، تو پھر خود ہی اپنے لیے کوئی نہ کوئی آشیانہ ڈھونڈھ لینگے۔ یہ بالکل سچ ہی، اور جو لوگ آج قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہرگز اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو گڑھے سے نکال کر اس کے لیے کوئی نیا محل بھی تیار کر دیں۔ یہ کام ان کا نہیں ہی، ان کا اصلی فرض یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہی کہ پانی بند ہی، اس کا بند توڑ دیں، جب وہ چلیگا تو خود اپنا راستہ نکال لیگا، اور اگر خود نہ نکال سکیگا تو پھر انجنیر آئینگے اور اس کے لیے ایک مستقیم نہر کا خط کھینچینگے۔

یہ اصلاح کے تقسیم عمل کا ایک سچا اصول ہی، مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لیے وہ قومیں موزوں ہیں، جن کے یہاں تقسیم عمل کے لیے دماغوں اور ہاتھوں کی کمی نہیں۔ ان کے یہاں ایک دماغ صرف نقاد ہوتا ہی جو صرف

نکتہ چینی کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ عمارت کی دیوار میں اس جگہ کجی ہے۔ پھر دوسری جماعت معماروں کی ہوتی ہے، وہ دیوار کو ڈھا کر از سر نو اٹھاتی ہے۔ مگر مسلمانوں میں اصلی سوال دماغ اور رائے ہی کا نہیں، بلکہ آدمیوں کا ہے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں آدمی نہیں، اور آدمی مشینوں میں ڈھل نہیں سکتے۔ پس ہم کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی پر نظر رکھنی چاہیے، اور اس لیے ہر شخص کو صرف اپنا فرض ہی نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اپنے امکان اور مقدور پر نظر رکھنی چاہیے۔

امن کے زمانے میں جب فوج اپنی اپنی بارکوں میں رہتی ہے، تو توپ چلانا سیکھتی ہے، ان کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لیے ہوئے نہیں پھرتی، لیکن جب جنگ کی نازک گھڑیاں آجاتی ہیں تو پھر اس وقت صرف فرض اور ذمہ داری ہی ہر شخص کی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اپنے اپنے مقدور اور اپنی اپنی طاقت بھر جو سپاہی جس قدر کام کر سکتا ہے اس سے دریغ نہ کرے۔ اگر پہاڑ سامنے آکر حائل ہو جاتے ہیں تو سپاہی خچروں اور مزدوروں کا انتظار نہیں کرتے۔ خود ہی توپوں کو کھول لیتے ہیں، خود ہی اپنی پیٹھوں پر لاد بھی لیتے ہیں، اور پھر خود ہی وقت پر ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ اسلام کے لیے درحقیقت یہ ایک جنگ کی نازک گھڑی ہے، جس میں وہ اپنے ہر سپاہی سے صرف اس کی ڈیوٹی ہی کا نہیں، بلکہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے، اس کا طالب ہے۔ اس وقت کام کرنے والوں کو خود ہی تجویز پیش کرنی چاہیے، خود ہی قوم میں اس کی دعوت پھیلانی چاہیے، اور پھر کوشش کرنی چاہیے کہ ہو سکے تو خود ہی اس تجویز کو عمل تک پہنچائیں اور اگر نئی تلاش کی دعوت دی ہے تو خود ہی اس کو ڈھونڈھ کر سامنے بھی کر دیں۔

اسی بنا پر اب ہم گذشتہ کے ذکر و افسوس کو بالکل بیکار سمجھتے ہیں۔ اصلی کام یہ ہے کہ پچھلی راہ سے ہٹانے کے بعد اب قوم کے آگے ایک نئی راہ کھول دی جائے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس بارے میں رب کریم و عزیز و حکیم نے جو خیالات ہمارے دل میں ڈالے ہیں، اُن کو آئندہ نمبر میں پیش کرینگے۔ اور تمام باتیں اُسی کے فضل و توفیق پر موقوف ہیں۔ وَاللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

الصراط المستقیم

(۱)

مسلمانوں کی آیندہ شاہراہِ مقصود کیا ہونی چاہیئے؟

مرادِ خضر عناں گیر باید از چپ و راست
کہ کج روی نہ کنم ورنہ عزمِ راہ خطاست

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

ہم نے گذشتہ دو نمبروں میں مسلمانوں کے موجودہ تغیرِ خیالات کو صحیح امید کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ ہر اصلاح کی بنیاد اولین تغیرِ خیالات و جنبشِ افکار رہے، اس لئے اس تعبیر میں کوئی مبالغہ و اغراق نہ تھا، لیکن آج جن

امور پر ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں ، یہ وہ امور ہیں ، جن سے اگر بے پروائی کی گئی ، تو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہی تغیر صبح امید نہیں ، بلکہ گمراہیوں اور باطل پرستیوں کی ایک سخت خطرناک شب یلدا ہو جائے گی

جمود اور حرکات

حقیقت یہ ہے کہ خیالات کی جنبش اور حرکت فی نفسہ کوئی مفید شے نہیں ہے۔ جب تک وہ کسی آئندہ صحیح اجتہاد افکار سے متصل نہ ہو جائے اگر ایسا نہ ہوا ، تو حرکت محض بعض حالتوں میں بے کار و لاحاصل ، اور اکثر حالتوں میں جمود سے زیادہ مہلک اور خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

بالفاظ سادہ تر ، اس کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص مدتوں سے ایک جگہ بیٹھا ہے ، بالکل بیٹھا رہنا زندگی کے لئے نہایت مضر اور اعضاء و جوارح کو معطل کر دینے والا ہے ، اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ وہ حرکت کرے یہ نہایت عمدہ خیال ہے ، لیکن یہ حرکت اس وقت مفید ہوگی جب آپ اسے چلا کر کسی عمدہ باغ کی روش پر لا کھڑا کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ نے اس میں حرکت پیدا کر کے سامنے کے گڑھوں سے اسے نہ بچایا ، اور وہ غریب اس میں گر گیا ، تو اس حرکت سے تو اس کا بیٹھا رہنا ہی بہتر تھا۔

مسلمانوں کے لئے خطرات حیات اب شروع ہوں گے

لیڈروں کا طبقہ اپنے گذشتہ عہد کو خواہ جدوجہد کی ایک شاندار تاریخ سمجھے ، مگر ہمارے نزدیک مسلمانوں کی حرکت کی تاریخ اگر شروع ہوگی تو اب سے شروع ہوگی۔ وہ فی الحقیقت اب تک سو رہے تھے ، زندگی کی ان

میں کوئی حرکت نہ تھی، اور نیند نے ان پر موت کا جمود طاری کر دیا تھا (وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ) ایک سوئے ہوئے انسان کے لیے اس کی کوئی بحث نہیں ہوتی کہ دوڑنا بہتر ہے یا آہستہ چلنا؟ تکیہ لگا کر بیٹھنا بہتر ہے یا دو زانو ہو کر بیٹھنا؟ کیونکہ یہ حالتیں اُسے پیش ہی نہیں آتیں۔ لیکن وہ اب جاگے ہیں، ان کو بیٹھنا بھی پڑے گا، اُٹھنا بھی پڑے گا، اور کبھی آہستہ خرامی اور کبھی تیز قدمی سے چلنا بھی پڑے گا۔ پس اب اُن کی حالت پہلے کی سی بے خطر نہ ہوگی، کیونکہ امن موت میں، مگر خطرہ صرف زندگی ہی میں ہوتا ہے۔ جب تک غافل پڑے ہوئے اینٹھ رہے تھے تو نہ اُن کو فرش گل پر چلنا تھا، اور نہ جنگل کے خارزار پر، لیکن اب دونوں طرح کی زمینوں پر اُن کے قدم پڑ سکتے ہیں۔ اس لئے فی الحقیقت سوچنے، غور کرنے، اور حزم و احتیاط کا وقت اب آیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بیٹھنے کی جگہ اُٹھ کھڑے ہوں، کچھ بعید نہیں کہ آہستہ چلنے کی جگہ بے اختیار دوڑنے لگیں۔ ٹھوکریں بھی کھا سکتے ہیں، اور در و دیوار سے ٹکرا بھی سکتے ہیں کیونکہ اب وہ سوئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زندہ اور متحرک ہیں۔ خطرات سے مقابلہ زندگی اور حرکت میں ہوتا ہے۔ جمود اور سکون میں نہیں ہوتا۔

پس پہلے نہیں تو اب ضرورت ہے کہ ایک ایسی حقیقی رہنمائی کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ ہو، جو انھیں معطل بیٹھنے نہ دے۔ چلاتا رہے، لیکن ساتھ ہی نگران بھی رہے کہ کہیں راہ کے اِدھر اُدھر گڑھوں اور غاروں میں پھسل نہ پڑیں۔

مرا در خضر عناں گیر باید از چپ و راست
کہ کج روی نہ کنم، ورنہ عزم راہ خطاست

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

کہ مسلمانوں کے لئے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنما ہو سکتا ہے اور ایک ہی چشم نگراں ہے، جو لغزشوں سے بچا سکتی ہے۔ یہ وہی ہے جو کبھی کوہ سینا پر تجلی حق بن کر چمکی، کبھی فاران پر ابر رحمت بن کر نمودار ہوئی۔ کبھی غار ثور میں لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کی صدا میں تھی، کبھی بدر کے کنارے اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ کے پیغام میں تھی، کبھی احد کے دامن میں وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ کی بشارت تھی اور آج بھی ایک لٹے ہوئے کارواں، ایک برباد شدہ قافلے اور ایک برہم شدہ انجمن کے لئے امید کا آخری سہارا اور زندگی کی آخری روشنی ہے:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔	کون ہے کہ جب ایک مضطر اور بے قرار روح اس کو پکارتی ہے تو اس کی فریاد کو سنتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے؟ اور کون ہے کہ اس نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا اور اس کی وراثت بخشی، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟
اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا	پھر بتلاؤ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے اور باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت کے لئے بھیج دیتا ہے۔ کیا خدا کے سوا کوئی دوسرا ہے؟

دنیا میں جب کبھی کسی بنی آدم نے اصلاح حیات کی کوئی منزل طے کی ہے

تو صرف اسی ہاتھ کی رہنمائی سے، اور جو اس کی رہنمائی میں آگیا، پھر اس کے لئے گمراہی نہیں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶-۴۷)
خدا جب کسی شخص کو راہِ راست پر چلانا چاہتا ہے تو اس کا دل اسلام کے لئے کھول دیتا ہے

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹:۲۲)
اور جس کا دل کھول دیا گیا، تو پھر وہ اپنے پروردگار کی روشن کی ہوئی مشعلِ ہدایت اپنے سامنے پاتا ہے۔ مگر افسوس ان لوگوں پر جن کے دل ذکرِ الٰہی سے غافل ہو کر سخت ہو گئے ہیں۔

اوّلین اور بنیادی مسئلہ

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اس تغیرِ خیالات کا منشا کیا ہے؟ اور رخ کس طرف ہونا چاہیئے؟ ہم کو نہایت رنج اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس لحاظ سے موجودہ تغیراتِ خیال کا منظر زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے ہم صاف صاف اور بآوازِ بلند کہہ دیتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی قدیمی پالیسی کو صرف اس لئے چھوڑنے ہیں کہ تنسیخِ بنگال، اور مسئلہ یونیورسٹی کی وجہ سے وہ گورنمنٹ سے روٹھ گئے ہیں، یا یہ تغیر صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ آزاد خیال ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی پولیٹکس! پالیٹکس!! پکارنے کے لئے مضطرب ہیں، تو وہ یاد رکھیں کہ اس نئے تغیر اور انقلاب میں اُن کے لئے کوئی برکت نہیں ہے بہتر ہے کہ اب تک جہاں پڑے سسک رہے تھے، وہیں بقیہ ایامِ ذلت و خواری

اور کاٹ لیں۔ تاریکی ہی میں رہنا ہے، تو پھر اس سے کیا بحث کہ وہ کوئی گڑھا ہے، باقاعدہ بنایا ہوا تہہ خانہ؟ آج تک اُن کی تمام ناکامیوں کی علتِ حقیقی یہ رہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے اعمالِ زندگی کی کسی شاخ کو "سلطانِ قرآن" کے ماتحت نہیں رکھا اور جب کبھی کوئی تحریک شروع کی، یا اپنے لئے کسی پالیسی کا پروگرام مرتب کیا، تو قرآن کریم کو اس طرح بھولے رہے، گویا اس کا نزول تاریخِ عالم کا کوئی واقعہ ہے ہی نہیں، اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ اس نام کی کسی کتاب کے پیرو ہیں۔ اگر مسلمان اس تغیر کے بعد پھر اسی گمراہی میں پڑنا چاہتے ہیں تو یہ ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں پھنسنا، اور ایک دام سے نجات پاکر دوسرے میں گرفتار ہونا ہوگا۔ پھر اگر گمراہیوں کے قفس ہی میں ہمیشہ مقید رہنا ہے تو موجودہ قفس میں کون سی برائی ہے کہ نئے پنجرے کی جستجو کی جائے؟

بے شک تقسیم بنگال کی تنسیخ اور یونیورسٹی کا مسئلہ ہمارے جمود و غفلت کے لئے ایک تازیانۂ تنبیہ ضرور ہے، اور ہم یقیناً شر الدواب عند اللہ ہوں گے، اگر اس سے عبرت نہ پکڑیں، لیکن ہماری آئندہ پالیسی کی بنیاد کوئی وقتی یا فوری واقعہ نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ وہ ایک مستقل اور دائمی اعتقاد ہونا چاہیئے جو اپنے قیام کے لئے کسی بیرونی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ کل گورنمنٹ نے پھر بنگال کے دو نہیں بلکہ دس ٹکڑے کر دئے اور وزیر ہند نے اعلان کر دیا کہ یونیورسٹی کا نام علی گڑھ نہیں بلکہ مسلم ہوگا، کیونکہ جو گورنمنٹ ایک مرتبہ تقسیم کر کے اُسے منسوخ کر سکتی ہے، وہ اب سب کچھ کر سکتی ہے پھر کیا اس حالت میں مسلمانوں کی پالیسی پر ایک تیسرا انقلاب طاری ہو جائے گا؟

اور پھر تعبیر! تعبیر!! کی صدا بلند کی جائے گی؟ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ کا کوئی عقیدہ، کوئی خیال، کوئی مقصود، کوئی نصب العین اور کوئی اصلی پالیسی نہیں، آپ صرف گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی حرکت کا نام ہیں اور صرف اُسی کو تکتے رہتے ہیں۔ اگر مصلحتاً لطف و مہر کی علامتیں نمایاں ہوئیں تو سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کہہ کر سربسجود ہو گئے، اور اگر مصلحت نے گوشۂ چشم رقیبوں کی طرف پھیر دیا، تو لگے منہ بسورنے اور آنسو بہانے۔ سوال یہ ہے کہ خود آپ کے پاس بھی کوئی شے ہے یا نہیں؟

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیم بنگال کی تنسیخ سے نہیں بلکہ پیشتر سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبانہ پالیسی کا ولولہ رکھتے ہیں، گو عام راہ ضلالت سے الگ رہنے کا انھیں الاؤنس دینا چاہیے، لیکن افسوس ہے کہ ان کے سامنے بھی ہندوؤں کی پولٹیکل جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں بے شک ہمارے عقیدے میں بھی آج کل مسلمانوں کے لئے عبرت و تنبیہہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی، لیکن پیروان "امام مبین" کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی کہ اعمال زندگی کے ایک ضروری شعبے میں ان کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہو گیا ہو، اور اس کی طرف سے مایوس ہو کر انھیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں

پر ٹلجانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے، یا بسترِ نزع پر سورۂ یاسین کو دہرا دینے ہی کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ اس بارے میں ہمارے خیالات الحمد للہ، عام خیالات کی سطح سے بہت بلند ہیں اور گو موقع نہیں، مگر ضمناً ان کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں "وحدہ لاشریک" ہے کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح اس کا "قرآن کریم" اپنی جامعیت اور کمال تعلیم میں "وحدہٗ لاشریک" ہے۔ اور بالکل اسی طرح اس کا لانے والا رسول کمال انسانیت و تعبد اور قوائے نبوت و اصلاح میں بھی "وحدہٗ لاشریک" ہے۔ ان کی صفات و خصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

راہ نسبت طلبی ہیں کہ چہ شایاں رفتم

پس ضرور ہے کہ جو امت اس خدائے واحد، اس قرآنِ واحد، اور اس رسول واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو، وہ بھی اپنے اندر اس شانِ وحدت و یکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمال زندگی کی ہر شاخ میں "وحدہ لاشریک" ہو۔ اس کے اعمال و خصائص بھی "من ذا نی نفذ داء الحق" کی صدائے اتحاد سے غلغلہ انداز عالم ہوں۔ تمام دنیا کی قومیں اس کے اعمال کا اتباع

کریں۔ زندگی کے ہر حسن و جمال میں اس کے خال و خط، مرقع عالم کے لئے نمونہ بنیں
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے یہی معنی ہیں، اور اسی لئے
مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (۸ : ۲۹)

مسلمانو! اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے متقی بن جاؤ گے تو وہ تمہارے لئے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دے گا۔

جس قوم کو اس صدائے الٰہی نے مخاطب بنایا ہو، اس کے لئے اس سے بڑھ کر کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لئے نمونہ بننے کی جگہ، خود دوسروں کو اپنا کعبۂ مقصود اور قبلۂ آمال بنا رہی ہے؟ سیاسی بحث تو ضمنی ہے۔ ہمارا اصلی ماتم صرف اتنے ہی پر موقوف نہیں، ہم کو تو یہ نظر آ رہا ہے کہ آج مسلمانوں کے لئے تعلیم، اخلاق، معاشرت، سیاست بلکہ مدنی زندگی کی ہر شاخ میں ان کے لیڈر صرف اسی کو فرض رہنمائی سمجھتے ہیں کہ ان کے آگے دوسری قوموں کے اعمال پیش کریں۔ تہذیب انسانیت کی ضرورت ہے تو مسلمان یورپ کی شاگردی کریں۔ پولیٹکل آزادی کی ضرورت ہے تو اپنی ہمسایہ قوموں سے بھیک مانگیں۔ پھر ہمیں بتلایا جائے کہ خود بدبخت مسلمانوں کے پاس بھی کچھ ہے یا نہیں؟ جو مسلمانوں کے رہنما قوم کے جلب قلوب کے لئے مذہب کے ذکر کو ناگزیر دیکھ کر، اپنے شاندار اسٹیجوں پر مذہب! مذہب! اور اسلام! اسلام! پکارتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ خود ان کی زندگی میں اس اسلام

کا اثر کہاں تک موجود ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ انھوں نے کبھی قوم کو یہ بھی بتلایا ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں خود اسلام کا نمونہ کیسا ہے؟ اور اگر نہیں بتلایا ہے تو قوم کے لیے ایک مسیحی رہنما اور ایک مسلمان لیڈر میں کیا فرق ہے؟ سچ یہ ہے کہ وہ غریب خود جس متاع سے تہی دست ہیں، دوسروں کے آگے کیا پیش کریں گے

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار؟

یہی بنیادی گمراہی ہے، جس نے جسم ملت کی ریڑھ کی ہڈی تک کو گھلا دیا ہے۔ مسلمان اگر مسلمان ہوتے، تو سمجھتے کہ ان کے لئے خود ان کے سوا دنیا میں اور کوئی نمونہ نہیں ہو سکتا۔ اگر فی الحقیقت دنیا کی کسی قوم کے پاس کوئی عمدہ خیال کوئی واقعی سچائی، اور کوئی اچھا عمل پایا جاتا ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بدرجہ اولیٰ اسلام میں موجود ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اس کی اچھائی بھی قابلِ تسلیم نہیں۔ اسلام کے معنی کی اصلی وسعت سے دنیا بے خبر ہے۔ اسلام تو اعتقاد و عمل کی ہر صداقت اور کائنات کے ہر حسن و جمال کا نام ہے۔ جہاں کہیں صداقت اور جمال موجود ہے، یقین کرنا چاہیئے کہ وہ اسلام ہے، گو دنیا کو اس کی خبر نہ ہو۔ وللہ درما قال

عبارا تنا شتیٰ ، و حسنک واحد
وکل الیٰ ذاک الجمال یشیر

اللہ اللہ! خدا تو مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ مجھ کو نمونہ بناؤ، اور میری صفات کاملہ سے مشابہت پیدا کرو (تخلقوا باخلاق اللہ) اور آج مسلمان ہیں کہ انسانوں کو اپنا اسوۂ حسنہ بناتے ہیں کہ (تخلقوا باخلاق الافرنج)

ور اگر کوئی اُن کی نقالی بن آتی ہے تو "انالا فرنج" کا نعرہ لگا کر اس قدر نازاں ہوتے ہیں، کہ حسین بن منصور کو "انا الحق" پر بھی اتنا ناز نہ ہوگا!!
كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان جس قدر اصلاح کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، اتنے ہی ضلالت اُن سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ جس قدر ترقی! ترقی! پکارتے ہیں، اتنی ہی تنزل! تنزل! کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ گویا دلدل میں پھنس گئے ہیں، جس قدر زور کرتے ہیں، اتنا ہی پاؤں اور دھنستا جاتا ہے یا ان کے رشتہ فلاح میں بدبختی کی گرہ پڑ گئی ہے، جس قدر کھینچتے ہیں، اتنی ہی وہ اور زیادہ کستی جاتی ہے۔ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴: ۴۰)

جو قوم خدا سے اپنا رشتہ کاٹ دیتی ہے اور اس کے فرمان و احکام سے روگردانی کرتی ہے، اس کے اعمال نورِ الٰہی سے خالی ہو جاتے ہیں۔ اس پر ضلالت و گمراہی کا ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور وہ اس کو اپنا مرکب بنا کر اس کے گلے میں اپنی اطاعت کی زنجیریں ڈال دیتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۴۳: ۳۶)

اور جو شخص خدا کے ذکر سے روگردانی کرتا ہے ہم اس پر ضلالت کا ایک شیطان متعین کر دیتے ہیں جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔

پھر وہ یکسر گمراہی اور ضلالت ہو جاتی ہے، اس کی زندگی ناکامی و

نامرادی کی تصویر بن جاتی ہے۔ وہ طلب مقصود میں آوارہ گردی کرتی ہے مگر چونکہ مقصود تک پہنچانے والے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہیں ہوتا، اس لئے کبھی مقصود تک نہیں پہنچتی۔ مسلمانوں کے تمام ترقی کے ولولوں اور اصلاح کی کوششوں کا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ نامرادی کے سوا انھیں کچھ حاصل نہیں۔ ان کے لیڈر پانی کو ڈھونڈتے ہیں، مگر دوڑتے ہیں ریگ زار کی طرف:

اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا (۲۴: ۳۹)	ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے، جیسے چٹیل میدان میں چلتا ہوا ریت ہوتا ہے کہ پیاسا دور سے اس کو پانی سمجھ کر

چلا، مگر جب پاس آیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

عود الی المقصود

پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بن کر نہیں۔ آپ کے ہاں اگر شمع کا نوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر یہ بھی ہے کہ فرض کیجئے کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی، جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں ان میں تغیر و تبدل ہر وقت ممکن ہے، البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے؟ ذرا غور سے کام لیجئے کہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو، لیکن وہ ایک ایسی راہ پیدا کریں جو ان کی مستقل اور

مخصوص راہ ہو جس میں کبھی تغیر کی ضرورت نہ ہو، تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہوں نیز کہا جا سکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ محض خارجی حالات کے تابع ہو کر آپ اپنے تئیں بالکل بھول جائیں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی پالیسی صرف گورنمنٹ کے انداز نظر کا نام ہو۔ لطف و مہر کی بہار آئے تو آپ کی پالیسی دوسری ہو۔ اغماض نا اعتراض کی باد خزاں چلے تو آپ کا آشیانہ دوسری جگہ بن جائے تقسیم بنگال کی تقسیم و ترکیب اور یونیورسٹی کا الحاق وعدم الحاق آپ کی پالیسی کو تیار نہ کرے۔ بلکہ آپ کے منقسم اقلیم دل کا اتصال اور آپ کے شکستہ رشتۂ الٰہی کا الحاق، آپ کے لئے ایک دائمی اور ناممکن التبدیل پالیسی مہیا کردے۔

(۲)

مسلمانوں کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

پالٹیکس جس کی طرف اب مدتوں کی غفلت کے بعد مسلمانوں نے شیفتگی کی نظر اٹھائی ہے، قومی زندگی کے اعمال کا ایک سب سے بڑا شعبہ ہے لیکن ہم اسے مسلمانوں کے لئے کوئی اصلی مقصود اور بنیادی شے نہیں سمجھتے۔ اور قوموں کے لئے اگر سیاست اُن کے تمام اعمال کی بنیاد ہے، تو اس لئے کہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے وہ سیاسی جذبات سے ایک گرم انگیٹھی کا کام لیتے ہیں، لیکن جس قوم کے پاس ایک شعلہ فشاں آتش کدہ موجود ہو، اُسے انگیٹھی کی کیا ضرورت ہے۔

جب تنور گرم ہو جاتا ہے تو بہت سی انگیٹھیاں اس سے گرم کر لی جا سکتی ہیں لیکن انگیٹھی تنور کا کام نہیں دے سکتی۔

اس وقت برسوں کے جمود نے کروٹ لی ہے اور گویا انقلاب و تغیر کا ایک اچھا موسم مسلمانوں پر گذر رہا ہے۔ اس وقت جس چیز کی تخم ریزی کر دی جائے گی، آگے چل کر اُسی کے پھل کو اپنے دامن میں دیکھ سکیں گے۔ پس اس بارے میں میری دعوت کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان محض پالٹیکس ہی کو اپنا مقصودِ حقیقی نہ بنائیں اور اس طرح ایک عمدہ موسم کو، جس میں وہ شاید ایک پورا باغ لگا سکتے ہیں، صرف ایک درخت ہی کے بونے میں ضائع نہ کر دیں۔ دوسری قوموں کی نظروں پر نظر رکھنا اُن کے لئے کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ ان کو صرف اپنے اوپر نظر رکھنی چاہیئے، کیونکہ ان کے پاس ایک شے ہے، جو اوروں کے پاس نہیں ہے اور جس کو اپنا مقصود بنا کر وہ ان تمام چیزوں کو بھی بوجہ احسن و اکمل لے سکتے ہیں، جو اور قومیں حاصل کر رہی ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شے کو اپنا اصل مقصود اور نصب العین بنائیں، جس کی تلاش میں انھیں گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمیشہ سے وہ خود ان کے گھر کے اندر موجود ہے۔ یعنی صرف اتباعِ دینِ متین اور اعتصام بحبل اللہ المتین ان کے لئے اُن کے خدا کی طرف سے ایک دائمی مقرر کردہ نصب العین ہے، اور ایک مسلم ہستی کے لئے اس کے سوا کوئی مقصودِ حقیقی نہیں ہو سکتا۔ نہ پالٹیکس، نہ تعلیم، نہ اخلاق، اور نہ معاشرت۔ کیونکہ زمین پر جس قدر "کمال" اور "جمال" ہے، وہ سب اس سے ہے، یہ کسی چیز سے نہیں۔ دنیا میں جس قدر خوبیاں

اور محاسن ہیں، سب اس کے نیچے ہیں، کیونکہ اس کے اوپر الوہیت کے درجے
کے سوا اور کوئی درجہ نہیں۔ دنیا میں جس وقت سے انسانی ہدایت و شقاوت
کا سلسلہ شروع ہوا ہے، صرف یہی ایک صراط مستقیم اور ملت قویم تمام انسانی
فلاح و صلاح کا وحدہ لاشریک وسیلہ رہی ہے:۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ
تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ
إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
وَالْأَسْبَاطِ، وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَ
عِيسَىٰ، وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن
رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی یا
عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے (یعنی
اسلام کے سوا اور طریقے اختیار کرو)
اے پیغمبر کہہ دے کہ کبھی نہیں! ہمارے
نزدیک تو صرف ابراہیم کا طریقہ طریق ہدایت
ہے۔ اور اے مسلمانو تم بھی کہہ دو کہ ہمارا
طریق یہی ہے کہ اللہ پر ایمان لائے ہیں
اور قرآن پر، جو ہم پر اترا، اور اس
تعلیم پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،
یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتری،
اور موسیٰ اور عیسیٰ کو جو تعلیم دی گئی۔ اور بعض پر موقوف نہیں، بلکہ دراصل اور
تمام پیغمبروں اور رسولوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو تعلیم دی گئی، ان سب
کی تعلیم ایک ہی طریق اسلام کی تھی۔ پس ہم ان میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے
کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔

ترجوا النجات ولم تسلك مسالکھا ان السفینۃ لا تجری علی الیبس

اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولیٹکل پالیسی تیار کرلی ، کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام اُن کے ہاتھ میں ہوا ، آئرلینڈ کے حکومت طلبوں سے بھی بڑھکر جوش اور سرگرمی پیدا کرلی ، پالٹکس میں وہ ازسرتاپا غرق ہوگئے ، ان کا ہر فرد گلیڈ اسٹون اور مارے ہوگیا ، لیکن ساتھ ہی اگرانھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح پیدا نہ کی ، اپنے تئیں دین الہی کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا ، اور خشیۃ الہی اور زاد تقوی سے محروم رہے ، تو میں اُس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس کے لئے کبھی موت اور شکست نہیں ، اس بصیرت الہی کے ساتھ ، جس میں کبھی تزلزل اور تذبذب نہیں ، ازسرتاپا صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے ، اور پانی ڈباتا ہے ، اگر آفتاب مشرق سے نمودار ہوتا ، مگر مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے اگر مچھلی خشکی میں ، اور پرند دریا میں زندہ نہیں رہ سکتا ، اگر قوانین فطریہ اور نوامیس طبیعیہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی ، اور اگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ نہیں ، بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں ، تو یہ بھی کبھی نہ ٹلنے والی صداقت ، اور صفحۂ کائنات پر نقش سنگی ہے کہ مسلمانوں کو یہ تمام نرہی سیاسی ہنگامہ آرائیاں ، تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیز ، اور پولیٹکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان طوفان آور ، ایک لمحہ ، ایک دقیقہ ، ایک عشر دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہنچاسکے گا ۔ ان کی تمام جد و جہد بے کار ہوجائے گی ۔ تغیر کا ابر ان پر سے بغیر ایک قطرہ بارش کے گذر جائے گا ۔ ان کی امیدوں کی خشک سالی بدستور باقی رہے گی ۔

وہ جس قدر سعی رہائی کریں گے، اتنا ہی چاروں طرف کی لپٹی ہوئی زنجیروں کی بندش سخت تر ہوتی جائے گی۔ گمراہی و ضلالت کا شیطان کبھی ان سے الگ نہ ہوگا۔ ان کے گلوں میں جو طوقِ مذلت، اور پاؤں میں جو زنجیرِ ادبار و تسفل پڑی ہوئی ہے وہ قیامت تک نہ ٹوٹے گی۔ جہالت و ضلالت، اُسرو غلامی، ذلت و خواری کی صفوں میں ہمیشہ محصور رہیں گے، اور دنیا میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو قومی عزت کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ، وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ (۷)۔

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جھکنے کی جگہ غرور سے اکڑ بیٹھے تو یاد رکھو کہ ان کے لئے نہ تو آسمانی برکت کا دروازہ کبھی کھلے گا اور نہ تو بہشت کی زندگی انھیں نصیب ہوگی۔ ہاں اگر ایسا ہو سکتا ہے کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گذر جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلا کر پھر فلاح و برکت بھی حاصل کر سکیں۔

میں نے کہا کہ "اگر آگ جلاتی اور پانی ڈباتا ہے"۔ نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ممکن ہے کہ آگ نہ جلائے اور پانی نہ ڈبائے، مگر یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ خدا کا وہ قانونِ شقاوت و ہدایت بدل جائے، جس کے لئے ابتدائے خلقتِ بنی آدم سے آج تک تاریخ میں کوئی تنہا شہادت موجود

نہیں۔ یہ میں لکھ رہا ہوں، اور میرے اندر یقین اور اعتقاد کی ایک آواز بے چین و مضطرب ہے، مگر افسوس کہ اس کی ترجمانی کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ حیران ہوں کہ کیوں کر، اور کن لفظوں میں اپنا دلی یقین آپ کے دلوں میں بھی پیدا کردوں؟ تاہم میں یہ کہنے سے کبھی نہ تھکوں گا، کہ جن احکام اسلام کو آپ نہایت بے پروائی سے ایک مذہبی بندش کہہ کر گذر جاتے ہیں، وہ بندش تو ضرور ہے مگر ایک ایسے قانون کی بندش ہے، جس کی سلطنت تمام قوانین مادیہ کے نظام حکومت سے بالاتر اور وراء الوریٰ ہے، اور نظم کائنات کے تمام اجزا اسی بندش سے بندھ کر مرتب اور منظم ہوتے ہیں۔ یہی بندش ہے کہ لسان الٰہی نے اس کو کہیں "حدود اللہ" کے لفظ سے یاد کیا ہے، کہیں "سنۃ اللہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کہیں "فطرۃ اللہ" اس کا نام رکھا ہے، کہیں "صراط مستقیم" کہا ہے، اور کبھی "دین قیم" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت ایک ربانی حکومت کا انتظام ہے، اور جب کوئی فرد یا قوم اس کے تحت و تسلط سے نکلنا چاہتی ہے تو وہ گویا خدا کے ساتھ اعلانِ جنگ کر دیتی ہے۔ پھر اس کی زندگی اور زندگی کے تمام اعمال یکسر بغاوت اور سرکشی ہو جاتے ہیں، اور وہ رحمانی سلطنت سے نکل کر شیطانی حکومت میں داخل ہو جاتی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ	خدا کہتا ہے کہ اے انسان حقیر!
بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۸۲:۶)	بتلا کہ کس چیز نے تجھ کو اس پر

آمادہ کر دیا کہ اپنے رب کریم سے بغاوت کر دے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک باغی انسان کو کوئی گورنمنٹ پناہ نہیں دے سکتی۔

اسی طرح رب السموات والارض کی بغاوت اور قانون شکنی کے بعد بھی کائنات کا ہر دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔ کسی سعی میں وہ کامیاب نہیں ہوتا، اور کوئی کوشش اس کی فلاح یاب نہیں ہوتی:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيناً فلن يقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین (۳-۷۹)

جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا، اس کی سعی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی۔ اور اس کے تمام کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہوگا۔

قرآن مجید نے امم سابقہ و اقوام ہلاکت کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ اس "قانون ہدایت و شقاوت" کے نتائج پر انسان کو توجہ دلائی جائے۔ جا بجا ان اقوام متمدنہ و عظیمہ کے طرف اشارہ کیا ہے جو آنے والی اقوام سے زیادہ قوی اور مستحکم تمدن رکھتی تھیں۔ لیکن جب انھوں نے احکام الہیہ کو پس پشت ڈال دیا، اور خدا کی حکومت میں رہ کر اس سے بغاوت اور سرکشی شروع کر دی، تو کوئی انسانی سعی و تلاشِ فلاح ان کو ہلاکت و بربادی سے نہ بچا سکی یہاں تک کہ آج اُن کے آثار و اطلال بھی دنیا میں باقی نہیں :۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا

کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں؟ اگر پھرتے تو دیکھتے کہ جو قومیں اُن سے پہلے ہو گذری ہیں، ان کا کیا انجام ہوا؟ یہ وہ قومیں تھیں، جو ان سے تمدن و

أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا، وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۳۰-۸)

ترقیات اور قوائے جسمانی میں بڑھ کر تھیں، انھوں نے زمین پر اپنے کاموں کے نشان چھوڑے، اور جس قدر تم نے اس کو متمدن بنایا ہے اس سے کہیں زیادہ انھوں نے تمدن پھیلایا۔ لیکن جب ہمارے رسول ان میں بھیجے گئے اور ہماری نشانیاں ان کو دکھلائی گئیں تو انھوں نے سرکشی اور بغاوت سے جھٹلا دیا، اور برباد و فنا ہو گئے۔ خدا ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن خود انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

یہی اسلام وہ قانون "حیات و ممات اقوام" ہے جس کی طرف قرآن نے جابجا اشارہ کیا ہے:

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا۔ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ

(۵۸ : ۲۲)

جتنی مصیبتیں اقوام و ملل پر نازل ہوتی ہیں اور جو خود تم پر نازل ہوئیں وہ سب ہم نے پہلے سے ایک کتاب میں لکھ رکھی ہیں (یعنی پہلے سے وہ بصورت ایک قانون منضبط کے موجود ہے۔) اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

کائنات میں حیات و قیام صرف مسلم کے لئے۔

اور غور کیجئے تو یہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے، جس کے لئے زیادہ دلائل آرائی مطلوب ہو، اور اگر مطلوب ہے تو اس لئے کہ دنیا میں آج اسلام

پیروؤں ہی کے لئے سب سے زیادہ اسلام کی دعوت معما ہو رہی ہے اسلام توفی الحقیقت ان قوائے فطریہ کے صحیح استعمال کا نام ہے، جن کی حکومت سے دنیا کی کوئی شے خارج نہیں۔ مچھلی کے لئے پانی میں تیرنا، پرندوں کے لئے ہوا میں اُڑنا، نباتات کا زمین میں نشو و نما پانا، اور انسان کا زمین کے اوپر رہنا، یہ سب چیزیں اسلام کے مفہوم حقیقی میں داخل ہیں کیونکہ اس کا دوسرا نام "سنت اللہ" اور "فطرۃ اللہ" ہے۔ پھر کیا مچھلی پانی کی جگہ ہوا میں، پرند ہوا کی جگہ پانی میں، اور انسان زمین کو چھوڑ کر سمندروں میں زندہ رہ سکتا ہے؟ اگر نہیں رہ سکتا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں کوئی شے غیر مسلم ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ حیات اور زندگی صرف مسلم کے لئے ہے۔ اور جو قومیں زندہ ہیں، گو ان کو معلوم نہ ہو، مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ اسلام ہی کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ اپنی بدبختی ہے کہ پاس رہ کر بھی ہم تشنہ لب ہیں:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ	کیا وہ لوگ دین الٰہی کو چھوڑ کر کسی
وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور تعلیم کو اپنا حاکم بنانا چاہتے ہیں؟
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا، وَاِلَيْهِ	حالانکہ اس آسمان اور زمین میں کوئی
يُرْجَعُوْنَ (۳ : ۱۴۲)	نہیں جو چار و ناچار اسی دین اللہ کا

مسلم، یعنی حکم بردار نہ ہو۔

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

پس باوجود اس کے کہ ہم پولیٹکل زندگی کو حیات ملی کا ایک ضروری

شعبہ سمجھتے ہیں، باوجود اس کے کہ ہمارے نزدیک کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے اندر سیاسی جذبات مشتعل نہ ہوں، اور باوجود اس کے کہ ہم روزِ اول سے مسلمانانِ ہند کی ایک بڑی بدبختی یہ قرار دئے رہے ہیں کہ اُن کے لیڈروں نے غلامی وخوشامد کی داروے بے ہوشی سے قوم کی قوم کو مرض النوم میں مبتلا کردیا؛ ہم مسلمانوں کو کبھی یہ صلاح نہیں دیں گے کہ وہ صرف پولیٹکل آزادی کے ولولے ہی کو پیدا کرکے اصلاح وتغیر کی طرف سے فارغ البال ہو جائیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لئے پولیٹکل پالیسی کے تغیر میں کوئی برکت نہیں ہوسکتی، اگر اُن کے اندر مذہبی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بخار کے مریض کے لئے ڈاکٹر کے آگے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اس کا جسم گرم کیوں ہے؟ اور آنکھوں میں سُرخی کیوں ہے؟ بلکہ اس پر غور کرتا ہے کہ بخار کی تولید کی اصلی علت کیا ہے؟ اگر آپ صرف مریض کے جسم کی حرارت ہی کے شاکی ہیں۔ تو زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں، ایک من برف منگوا کر اُس کے ریزوں میں اسے بٹھا دیجئے، اُمید ہے کہ سارا جسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ مسجد کا منارہ سیدھا نہیں، میں روتا ہوں کہ بنیاد ٹیڑھی ہے۔ آپ صرف پالیٹکس کو کیوں ڈھونڈتے ہیں، جبکہ ایک ایسی منضبط اور لازوال کرسی آپ کو ملتی ہے، جس پر نہ صرف پالیٹکس، بلکہ قومی زندگی کی عمارت کے تمام ستون کھڑے ہو سکتے ہیں، اور ستون کے لئے کرسی ناگزیر ہے۔

مسلمانوں کے لئے اولین کام۔

پس موجودہ تغیر کے بعد اب مسلمانوں کو سفر اسی منزل سے

شروع کرنا چاہیے جو ان کے سفر کا قدرتی مبدا ہے، اور جہاں سے ان کو پچھلا سفر شروع کرنا تھا، مگر انھوں نے نہیں کیا۔ ان کو نہ تو پولیٹکل پالیسی کی تلاش و جستجو میں وقت ضائع کرنا چاہیئے، نہ اعلیٰ تعلیم کے افسانہ لاانتہای میں پڑنا چاہیئے، نہ لیگ کے غلامانہ اور موت آور پالیٹکس پر توجہ کرنی چاہیئے اور نہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے لئے نسخۂ فلاح ڈھونڈھنا چاہیئے۔ ان کو صرف ایک ہی کام کرنا چاہیئے، یعنی بلا یہ سوچے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اپنا ہاتھ دست الٰہی میں دیدینا چاہیئے:

می بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست

نہ وہ پالٹیکس کو سوچیں اور نہ تعلیم کو، نہ آزادی کی بحث کریں اور نہ غلامی کا طوق پہنیں یہ باتیں ان کے سوچنے یا فیصلہ کرنے کی نہیں ہیں۔ ان کا فیصلہ خدا کو کرنا تھا، اور اسنے کر دیا۔ ان کا کام صرف یہ ہی کہ اتباع کلمات اللہ و جمیع "ماجاء بہ القرآن" کے لئے تیار ہو جائیں اور اپنے تئیں تمام انسانی تعلیموں اور اقوام کے اتباع و محاکات کے ولولوں سے خالی کر کے صرف اُس ایک ہی معلم کی تعلیم پر چھوڑ دیں۔ اگر اسلام ان کو پالٹیکس میں بلانا چاہے تو لبیک کہہ کے دوڑ جائیں اگر وہ اس سے اجتناب کی تعلیم دے تو تمہارے کے ساتھ ہی مجتنب ہو جائیں۔ اگر وہ کہے کہ غلامی اور خوشامد ہی وہی چیزیں اصلی ذریعۂ فوز و فلاح ہیں تو سر سے پاؤں تک غلامی کی تصویریں جائیں۔ اگر وہ کہے کہ آزادی اور حقوق طلبی ہی میں قومی زندگی اور عزت ہے تو ان کا وجود یکسر پیکر حریت و جہد حریت ہو جائے۔ اخلاق، تعلیم، تمدن، شائستگی اصلاح معاشرت، غرضکہ ایک متمدن زندگی کے جتنے اجزا ہیں، ان میں وہ

جس طرف بلائے۔ اسی طرف جھک جائیں۔ خود ان کی کوئی خواہش، کوئی ارادہ کوئی تعلیم، کوئی پالیسی نہ ہو۔ اُن کی خواہش اور پالیسی صرف اتباعِ قرآن ہو وہ اس تنکے کی طرح جس کو کسی بحرِ طوفان خیز میں ڈال دیا گیا ہو۔ اپنے تئیں تعلیمِ الٰہی کے سمندر میں چھوڑ دیں۔ جس طرف وہ چاہے، لے جائے، اور جس کنارے سے چاہے انھیں لگا دے۔ جب خدا ان کا تمام بوجھ اپنے سر لیتا ہے تو وہ خود اپنے کاندھوں کو کیوں تھکاتے ہیں؟

اگر مسلمانوں نے ایسا کر لیا، (اور وعدہ الٰہی ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا) تو وہ یاد رکھیں کہ آج جن چیزوں کے لئے بھٹک رہے ہیں، اور نہیں ملتیں، اگر ان کا مطلوبِ حقیقی یعنی اسلام ان کو مل گیا تو وہ خود بخود ان کے قدموں پر آ کر گر جائیں گی۔ ان میں سے ایک ایک کی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت گمراہ ہو چکے، جو سر عزت کی سربلندی کے لئے بنا تھا بہت ٹھکرایا جا چکا۔ اب بھی سنبھل جائیں کہ خدا کا ہاتھ بیعت کے لئے بڑھا ہوا ہے۔ وہ اُسے چھوڑ کر شیطان کے ہاتھ پر کیوں بیعت کرتے ہیں؟ ان کے تمام اعضا مردہ و غیر متحرک ہو رہے ہیں لیکن اس کے لئے سر میں تیل کی مالش یا تلوے کا سہلانا اصلی علاج نہیں ہے۔ ان کو روح کی ضرورت ہے۔ جس دن، جس آن، جس لمحے، ان میں اسلام کی گم گشتہ حرارتِ عزیزی عود کر آئے گی، اسی وقت پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر سر کے بالوں کی جڑ تک، اُن کا تمام جسم زندہ ہو جائے گا۔ ان کا اخلاق، ان کا تمدن ان کی سوشل حالت، ان کی سوسائٹی کا نظام، اور سب سے آخر

مگر سب سے پہلے یہ، کہ ان کی پولیٹکل حالت، غرضیکہ حیات ملی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہوگا، جو باحسن شکل و با کمل حال اُن کے پاس موجود نہ ہو جائے:

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللهِ وَهُوَ	اور جو شخص ہر طرف سے منہ موڑ کر
مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ	صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور
الْوُثْقَىٰ ۔ وَإِلَى اللهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ	ساتھ ہی اعمال حسنہ اختیار کئے

تو اس یقین کرو کہ اس نے مضبوط رسی تھام لی اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(۳۱)

احرام عہد روز ازل، کعبہ کوئے دوست
جز راہ عشق ہر کہ رود بر خطا رود

صحت کے لئے تندرست کو نہیں بلکہ مریض کو دیکھنا چاہیئے۔

اگر مریض پچھلی بد پرہیزیوں اور بیماریوں سے تنگ آکر چاہتا ہو کہ آئندہ کے لئے ایک صحیح و تندرست کی زندگی حاصل کرے، تو اس کے لئے حفظ و صحت کی کسی کتاب کے پڑھنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اپنی بیماریوں اور پچھلی بد پرہیزیوں کا مطالعہ کرے۔ مسلمان اگر آئندہ اپنی حیات ملی کو بیماریوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے گذشتہ اور موجودہ امراض، علی الخصوص اپنی بد پرہیزیوں پر نظر ڈالیں، اور آئندہ ان سے بچنے کا سامان کریں۔

مسلمانوں کے تمام موجودہ امراض کی اصلی علت جس نے مختلف عوارض کی شکلیں اختیار کرلی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے تعلیم الٰہی کے عروۃ الوثقیٰ کو چھوڑ دیا، اور اس کے ساتھ مہلک بد پرہیزی یہ ہے، کہ سعی اصلاح و ترقی کا جو قدم اُٹھایا، وہ مذہب سے الگ رہ کر اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحت و تندرستی ہی سے محروم ہوگئے۔ مسلمانوں میں پرانی تحریک تعلیمی ہے اور نئی سیاسی، لیکن دونوں کا یہی حال ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ پہلی پوری کامیاب نہ ہوئی، اور دوسری اپنی عمر کے چوتھے سال ہی میں بستر نزع پر پائی گئی اب جو کچھ ہے اس کی تجہیز و تکفین کی دھوم ہے کہ کئی کروڑ مسلمانوں کی بیجا رہ سا "متفقہ اور مسلمہ" پالیسی کے۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دین اور دنیا کی تفریق

ہم کو مسلمانوں کی گذشتہ جد و جہد ترقی پر بہت کچھ لکھنا ہے، کیونکہ جب تک پچھلی غلطیاں سامنے نہ آئیں، آئندہ کے لئے اُن سے پرہیز ممکن نہیں۔ لیکن یہ ایک مستقل موضوعِ بحث ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہیے ہیں کہ آج کل کانفرنسوں میں ہمارے قومی خطیبوں نے بزم آرائیوں کے لئے جو موضوع اختیار کر رکھے ہیں، ان میں ایک برسوں کا پامال مضمون دین اور دنیا کا باہمی تعلق بھی ہے۔ بار بار اس کو دہرایا گیا ہے، اور ہمیشہ زور دے دے کر کہا گیا ہے، کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق کا کوئی سوال نہیں، وہ دین کو دنیا سے الگ نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے کہ دین دنیا ہی کے

حسنِ عمل کا نام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثل آج کل کے بہت سے اقوال کے یہ قول محض بھی صحیح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اعمال کا کیا حال ہے؟ وہی مدعیانِ اصلاح جو اس صداقت کو زبانی دہراتے ہیں، ان کی ازسرتاپا زندگی، اور اُن کی تمام قومی تحریکوں کے اعمال میں بھی اس کا کچھ اثر ہے یا نہیں؟

حالت یہ ہے کہ خود ہمارے نئے لیڈروں نے دین اور دنیا کے اندر تفریق کی ایک ایسی جھیل حائل کر دی ہے، جو روز بروز دونوں کناروں کو دور تر کر رہی ہے، اور ان کو کسی طرح ملنے نہیں دیتی۔ انھوں نے قومی اصلاح و ترقی کی جس قدر تحریکیں شروع کیں، ان کو مذہب سے اس طرح الگ رکھا، گویا نہ تو پیروانِ اسلام ان کے مخاطب ہیں، اور نہ مسلمانوں کی قوم سے خود انھیں کوئی واسطہ ہے۔ ان کی زندگی، اُن کے اعمال، ان کی آواز، ان کی نظیریں، ان کی مثالیں، ان کے پیشِ نظر نمونے، بلکہ اُن کے تمام افعال و کردار یکسر اسلام سے بیگانہ، اور از فرق تا بقدم مذہب سے نا آشنا رہے۔ انھوں نے ہمیشہ دنیا کو دین سے الگ دیکھا، اور جب کبھی قدم اُٹھایا تو دنیا کی طرف، حالانکہ اگر دین کی طرف بڑھتے، تو دنیا خود اُن کی طرف دوڑتی۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ (۳۰: ۶)	یہ لوگ صرف دنیا کی ظاہری دلفریبیوں ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کو بالکل بھولے ہوئے ہیں۔

مذہب سے یہ الحاد آمیز بیگانگی یہاں تک بڑھ گئی ہے، کہ آج اگر کوئی

صدائے قرآنی بلند کی جاتی ہے، تو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے؛ بہت سے اس خیال پر متعجب ہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی بھی تعلیم قرآنی پر مبنی ہو۔ (وَرَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا) بہتوں کو یہ کہنے سے نفرت اور غصے کا بخار چڑھ آتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو کچھ ہے قرآن ہی میں ہے اور قرآن ہی سے ہے (قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ) اور بہت سے ہیں جو فرعون کے جادوگروں کی طرح خوف زدہ ہو رہے ہیں کہ کہیں مذہب کا عصائے موسوی ثعبانِ مبین بن کر ان کو نگل نہ جائے:

وَرَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷: ۳۹)

جن لوگوں کے دل مرضِ ضلالت سے مریض ہو رہے ہیں، تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے خوف زدہ ہو کر دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔

ہم کسی کی نیت کی نسبت زبان کھولنے کا حق نہیں رکھتے۔ لیکن واقعات اور نتائج بسا اوقات نیت کی پروا نہیں کرتے۔ اور حکم نتائج ہی پر مرتب ہوتا ہے۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ آج کل کے کارفرما طبقے میں بہت سے لوگ اعتقاداً ملحد نہ ہوں، لیکن اس اعتقاد کو لے کر کیا کیجئے، کہ عملاً سر سے پاؤں تک ان کی جس شے کو دیکھئے، حسنِ الحاد کی دلربائیوں کا یہ حال ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اور باتوں سے قطع نظر کیجئے، ہمارے اعتقاد میں سب سے بڑی یزداں فراموشی اور الحاد پرستی تو یہی ہے کہ ایک گروہ مسلمانوں کی اصلاح کا دعویٰ کرے، اور پھر اپنے تمام کاموں کے لئے اسلام کو اور اس کے خدا کو چھوڑ کر انسانی خیالات کے اصنام و طواغیت کو اپنا حکم بنائے

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا (۴: ۶۰)

اے پیغمبر ان لوگوں کو نہیں دیکھتے، جو اس زعم باطل میں پڑے ہیں کہ ہم مومن و مسلم ہیں حالانکہ وہ کیونکر مومن ہوسکتے ہیں جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر چاہتے ہیں کہ دوسروں کو اپنا حکم بنائیں۔ حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ خدا کے سوا دوسروں کی اطاعت سے انکار کردیں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں نہایت سخت درجے کی گمراہی میں مبتلا کردے۔

جن باتوں کو ہمارے لیڈر اسلام سے ناآشنا رہ کر کہتے رہے، اگر چاہتے، تو انھی باتوں کو وہ اسلام کی زبان سے ادا کرسکتے تھے۔ تعلیم اگر ضروری تھی، علوم جدیدہ کی اگر دعوت دینا چاہتے تھے، معاشرت میں ضروری تبدیلی کے خواہاں تھے یا اور جتنی باتیں قوم کے آگے پیش کرنا چاہتے تھے، ان میں کون سی شے ایسی ہے، جس کے لئے قرآن کریم اور تعلیم الٰہی کو سامنے نہیں رکھ سکتے تھے؟ پھر کسی دعوت کے لئے یہ طریقہ موثر تھا کہ انسانوں کی نظیر دی جائے، یا یہ کہ خدا کا حکم ہے؟ غور کیجئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟

اگر واقعی یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی دین اور دنیا دونوں ایک ہیں ، اگر یہ واقعہ ہے کہ وہ قرآن نامی ایک کتاب کے پیرو ہیں ، اس میں کوئی دھوکا نہیں کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول تھا جس کے پیش کئے ہوئے احکام اُن کے لئے ذریعہ فوز و فلاح ہیں ، تو ہمارے لیڈروں کی حالت اس سے بالکل متضاد بنی تھی ، جو آج ہم بدبختی سے دیکھ رہے ہیں ۔ وہ ایک ایسی جماعت ہوتی . جس کے دل اور زبان دونوں میں اسلام ہوتا ، جن کا ہاتھ کسی حالت میں قرآن سے خالی نہ ہوتا ، بلکہ قرآن کی گرفت سے اس طرح رُک جاتا ، کہ کسی دوسری شے کو اُٹھانے کی مہلت ہی نہیں پاتا ، وہ ازسرتاپا مذہب کی تصویر ہوتے ، اور یکسر تعلیم الٰہی کا علمی نمونہ ، ان کی ہر صدا مذہب میں ڈوبی ہوتی اور ہر قدم مذہب ہی کی جانب اُٹھتا ۔ اُن کی زبان کھلتی تو مذہب کے لئے اور قلم حرکت کرتا تو مذہب کے نام پر ۔ وہ ہر بہتر سے بہتر خیال ، اور ہر عمدہ سے عمدہ بات قوم کے آگے پیش کرتے ، مگر جو کچھ کہتے . مذہب کے واسطے سے اور جو کچھ لکھتے مصحف کی سیاہی سے ۔

وہ جب ہمارے سامنے آتے ، تو گو ان کے سروں پر ہیٹ ہوتا مگر زبان پر قرآن ہوتا ۔ ہمیں اس کی چنداں پرواہ نہ تھی کہ ان کے سر پر کیا ہے ؟ مگر اس سے کیوں کر غفلت کریں کہ اُن کی زبان پر کیا ہے ؟

لیکن ایسا ہوتا تو کیوں کر ہوتا ؟ دین و دنیا کی عملی تفریق نے قوم کی اصلاح و ارشاد کی باگ ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں دیدی ، جو اگر ایسا کرنا بھی چاہتی ، تو نہیں کر سکتی ۔ الحاد ان کے دل میں چپکے چپکے کام کر رہا

اور دماغ مذہب سے ناآشنا تھا، ان کو جس قرآن اور جس اسلام کی خبر ہی نہ تھی، اس کو قوم کے آگے پیش کرتے تو کیا کرتے؟

روح کی تلاش سے پہلے اُٹھ بیٹھنے کی سعی

پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ چاہتے ہیں، ایک سرد لاش اُٹھ کر بیٹھ جائے، تو یہ کوشش لاحاصل ہوگی کہ اس کے ہاتھ پر گرم گرم تیل کی مالش کریں، یا سر کو سینکنا شروع کردیں۔ بے شک ہاتھ ایک نہایت کارآمد اور ضروری عضو ہے، مگر صرف اس کو گرم کردینے سے زندگی کی حرارت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اصلی شے روح ہے، جس وقت روح جسم میں عود کر آئے گی، خود بخود تمام اعضا کام دینے لگیں گے۔ جسم ملت کی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ سیاست، اخلاق، تمدن، تعلیم، صلاح، معاشرت یہ تمام چیزیں اس کے لئے نہایت ضروری اور کارآمد اعضاء ہیں، لیکن ان سب کی زندگی روح پر موقوف ہے۔ میں نے کبھی لکھا تھا کہ قومی زندگی کے لئے دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں، پالیٹکس، اور مذہب۔ مگر یہ کہنا باقی ہے کہ اور قوموں کے لئے صرف پالیٹکس حیات بخش ہو تو ہو، مگر مسلمانوں کے لئے جن کا سارا کارو بار حیات مذہب ہی کے دم سے ہے، وہ روح مذہب کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار سنو!! وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ تمہارے اندر زندگی کی روح پھونک دے

وَقَلْبِهِ وَاَنَّهُ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ اور یقین کرو کہ اللہ انسان اور اس کے ارادوں میں جب چاہتا ہے آڑے آجاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ بالآخر ایک دن تم سب اُس کے آگے کھڑے کئے جاؤ گے۔

ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کرکے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں، اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں، جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو نہیں قرار دیں گے، اس وقت تک نہ اُن میں قومیت کی روح پیدا ہوگی، اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں اپنے لئے جو تاثیر رکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے، لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلے میں اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا" یا "اسلام" ہے

تشخیص کے بعد

اگر تشخیص کے بعد علاج آسان ہے، اگر گذشتہ امراض کی دریافت کے بعد آئندہ کے لئے حصول صحت میں کوئی دشواری نہیں، اور اگر صحت

کی آرزو کے ساتھ مرض کے حصول کی خواہش کبھی جمع نہیں ہو سکتی، تو مسلمانوں کے لئے اُن کی آیندہ شاہراہ مقصود کا سوال بالکل صاف ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ آج تک اُن کی تمام کوششیں اس لئے بار آور نہ ہوئیں کہ ان کو آگ کی تلاش تھی، چاہیے تھا کہ چنگاریوں کو پھونکتے تاکہ آگ بھڑکتی، اور تنور گرم ہو جاتا، لیکن وہ ہمیشہ راکھ کے ڈھیر کو پھونکتے رہے۔ اُن کی محنت میں کوئی شک نہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ راکھ کو پھونکنے سے آگ پیدا نہیں ہو سکتی:

ونار لو نفخت بہا اضاءت
ولکن انت تنفخ فی الرماد

ضلالت اعمال کی یہی مثال ہے جو قرآن حکیم نے دی ہے، اور فی الحقیقت قرآن کے سب سے زیادہ گہرے معارف اس کی مثالوں ہی میں ہیں:

مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ، اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ، لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ، ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ (۱۴:۱۸)	جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی طاعت سے انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے گویا راکھ کا ڈھیر ہیں، کہ آندھی کے دن اس کو ہوا اُڑا لے گئی۔ اسی طرح جو کام ان لوگوں

نے کئے ہیں، ان میں سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہی گمراہی بڑے درجے کی گمراہی ہے۔

مسلمانوں میں تعلیمی رفتار اب تک مقابلۃً کیوں سست ہے؟ پولیٹکل

آزادی کے دلولے کیوں اُن میں نہیں اُبھرے ؟ ایثار و قربانی کی مثالیں کیوں ناپید ہیں ؟ سحر نگار اہل قلم ، اور آتش بیان مقرر کیوں نہیں پیدا ہوتے ؟ ان سب کا جواب یہی ہے کہ ایک مردہ لاش سامنے تھی ، لیڈروں نے اس کے اعضا تقسیم کر لیے ۔ کسی نے تلوا سہلایا ، اور کسی نے سر سینکنا شروع کر دیا ، مگر روح کی کسی کو فکر نہیں ہوئی ۔ پھونکنے کے لیے بہتوں نے اپنے چہروں کو چولھے سے ملا دیا ، مگر جتنی پھونکیں ماریں ، وہ سب یا تو چولھے کی باہر کی مٹی اڑاتی رہیں ، یا اندر کی جمع شدہ راکھ کو بکھیرتی رہیں آگ بھڑکتی تو کیونکر بھڑکتی ؟ اور تمام اعضا کام دیتے تو کیونکر دیتے ؟ بدبختی ہے کہ اتنی صاف بات بھی کسی کے سمجھ میں نہیں آئی ؟

خلاصۂ مطالب

ہم نے گذشتہ تین نمبروں میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں ، بہتر ہوگا ، اگر ان کو بطور حاصل بیان کے یہاں عرض کر دیں ۔

۱۔ موجودہ تغیر خیالات ایک قیمتی فرصت ہے ، اگر ایک دیوار ٹیڑھی کھڑی کر دی گئی ہو اور آپ اُس کے نقص کو محسوس بھی کر لیں ، تاہم کسی بنی ہوئی چیز کا گرانا اور پھر از سر نو بنانا اس درجہ مشکل کام ہوتا ہے ، کہ ممکن ہے ، برسوں تک آپ کو نئی دیوار کھڑی کرنے کی مہلت نہ ملے ۔ لیکن اگر طوفان یا بارش کے ناگہانی حملے سے خود بخود وہ گر جائے ، تو پھر آپ کو نئی دیوار بہر صورت بنانی ہی پڑے گی ۔ یہی حال مسلمانوں کی قدیمی پالیسی کا ہے ، وہ خود بخود گر چکی ہے ۔ نئی پالیسی کی دیوار بنانے کے لیے اب پچھلی

دیوار کے گرانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کی ضرورت ہے کہ اب جو بنیاد رکھی جائے، وہ درست ہو۔

(۲) مسلمانوں کے لئے ہر شے ان کے مذہب میں ہے، پس اگر وہ آج کل پولیٹکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اُس شے ہی کو کیوں نہ پیدا کر لیں، جو نہ صرف پالٹکس، بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کر دے؟

(۳) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لئے نازل نہیں ہوا، بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل و اکمل قانون فلاح ہے، جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل، جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا، اُن کے لئے کبھی موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔

(۴) مسلمانوں کا تمام کاروبار خدا سے ہے، اور خدا کے سوا جو کچھ ہے وہ ان کے لئے اصنام و طواغیت یعنی بتوں کا حکم رکھتا ہے۔ پس جب تک وہ خدا کے آگے نہیں جھکیں گے، دُنیا کی کوئی چیز اُن کے آگے نہیں جھکے گی۔

(۵) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے۔ اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے، کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ "اسلام" ہی اُن کے لئے پالٹکس کی راہ کھولے گا، تعلیم کا حکم دے گا۔ اخلاق و خصائل میں تبدیلی پیدا کرے گا، اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں، نقصانوں

اور مضرتوں سے صاف ہوکر ان میں پیدا ہوجائیں گی۔ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔

(۴)

ہاں رہ عشق ست ، کج گشتن ندارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست

اِس تبدیلی کے نتائج

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر ایسی تبدیلی عمل میں میں آگئی (وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ) تو اس کے نتائج کیا ہوں گے ؟ آغاز مضمون میں جن آیندہ خطرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، وہ کیا کیا ہیں ؟

لیکن غور کیجیے تو در اصل ہماری دعوت اثبات فوائد و نتائج سے مستغنی ہے۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ ہر وہ انسانی عمل جو تعلیم الٰہی کی ہدایت بخشی سے خالی ہے ، کبھی فوز و فلاح نہیں پا سکتا۔ اگر ہم اپنی دعوت کی خوبیاں ثابت نہ کرسکیں تو کچھ ہرج نہیں ، کیونکہ اس کے لئے یہی ایک خوبی کافی ہے کہ اوروں کی دعوت انسانوں کی طرف ہے اور اس کی پکار تعلیم الٰہی کی طرف !

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

اور اس سے بہتر اور کس کی پکار ہوسکتی ہے ، جس نے اللہ کی طرف بلایا ، اعمال نیک انجام دے ، اور اپنے تئیں کسی انسانی نسبت کی طرف نہیں ، بلکہ خدا کی طرف منسوب کرکے کہا کہ میں صرف

مسلم ہوں۔

انسانی اعمال و اقوال دوسرے انسان کے لئے محتاج تصدیق ہیں، مگر خدا کی آواز جب انسان کو مخاطب کرتی ہے، تو وہ خود حق اور صداقت ہے اور اپنی تصدیق کے لئے کسی استدلال کی محتاج نہیں۔ اگر سچ کوئی متشکل وجود ہوتا، اور بولتا، تو کیا اس سے دلیل طلب کی جاتی کہ وہ سچ ہے؟ آفتاب اگر کہے کہ میں روشن ہوں، تو آپ اُس کے جواب میں کیا کہیں گے؟

ہم جلدی میں لکھ گئے کہ "ہمارا اعتقاد ہے" حالانکہ "ہر مومن قلب" کا یہی اعتقاد ہونا چاہیئے۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ صحیح الفطرت انسان جس کی فطرت اصلی کا ذوق خارجی اثرات ضلالت سے بگڑ نہ گیا ہو، کیونکہ انسان کی "فطرت اصلی" اور "اسلام" دو مترادف لفظ ہیں۔ اور فطرت انسانی کا اگر کوئی مذہب ہے، تو وہ اسلام ہی ہے، اس کے خلاف انسان کے جس قدر اعمال ہیں۔ ان کو خارجی اثرات کی پیدا کی ہوئی ضلالت سمجھئے۔ ہر ایسی ضلالت کو جو سرشت انسانی کے خلاف ہو، قرآن حکیم "عمل الشیطان" سے تعبیر کرتا ہے کہ عمل رحمانی تکوین فطرت اصلی و ودیعت تمیز ہدایت و ضلالت ہے۔ کما ورد فی الحدیث المشہور: کل مولود یولد علی فطرتہ (او علی فطرۃ الاسلام) وابواہ یھودانہ وینصرانہ (او کما قال)

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ ۔ پس صرف دین قیم فطری کے ہو جاؤ
فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ ۔ وہ خدا کی قائم کی ہوئی فطرت ہے

عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔ جس پر انسان پیدا کیا گیا اور خدا کی فطرت میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

پس ہر صحیح الفطرت انسان کے لئے یہ دعوت ایک ایسی صداقت بحث ہے جو کسی بحث و استدلال کی محتاج نہیں۔ یہ اس کے لئے کوئی نئی دعوت نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر کی اس صدائے فطرت کا اعادہ ہے، جو ہر آن اور ہر لمحہ اس کے اعماق قلب سے اُٹھ رہی ہے، اور اس نقش خلقت کا عکس ہے، جو نقاش قدرت نے اس کے صفحۂ جبلت پر کھینچ دیا ہے۔ اگر باہر کے غوغائے ضلالت نے اس کے سامعہ کو مشغول نہ کر دیا ہو تو جب کان لگائے، اُس آواز کو سُن سکتا ہے۔ اور جب آنکھ بند کرے اس نقش کو دیکھ سکتا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (۵۰: ۳۷)

اور اس میں بہت بڑی بصیرت ہے اس کے لئے، جو اپنے پہلو میں سوچنے والا دل رکھتا ہو، اور جس کے سر میں سننے والا کان ہو۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ دسترخوان کے لذائذ کا اعتراف کرنے کے لئے ایک تندرست شخص کی زبان چاہئے، نہ کہ ایک ایسے مریض کی، جو رات بھر تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر بستر سے اُٹھا ہو۔ اگر آپ کے منہ کا مزا بگڑا ہوا ہے، تو آپ شہد کو خنظل ثابت کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ اپنے کام و زبان کے ذوق رفتہ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

پس حقیقت اندیشی کی نظر ڈالیے، تو اتباع تعلیم الہی کے داعی کے سر حجت واستدلال کا کوئی بار نہیں ہے۔ اس نے جس وقت یہ کہا کہ تعالوا الی ما نُزِّلَ علی الرسول (اس تعلیم کی طرف آؤ جو خدا نے اپنے رسول کریم پر اتاری) تو وہ اسی وقت سبک دوش ہو گیا، کیوں کہ اگر اس کی دعوت دلیل کی محتاج تھی، تو اس نے دعوے کے ساتھ دلیل بھی پیش کر دی۔ روشنی کے لئے یہی دلیل ہے کہ وہ روشنی ہے۔ اس کی صداقت کی اس سے بڑھ کر برہان مبین کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انسانوں کی طرف نہیں بلاتا بلکہ داعی الی اللہ و ما نزل علی رسولہ ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ — اس تعلیم کی طرف آؤ جو تم میں اور ہم میں مشترک ہے۔ یعنی خدا کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائیں۔

تاہم کیا کیجیے کہ بدبختی سے زمانہ وہ آگیا ہے، جبکہ ایک مسلمان کے آگے اسلام کی خوبیوں کو ثابت کرنا بہ نسبت ایک مسیحی کے زیادہ ضروری ہے۔ عین نصف النہار کی دھوپ میں کھڑا ہو کر ایک حریف آفتاب سے مقابلے کی آنکھیں لڑاتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ اس کے روشن ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ پیاس کسی کو نہیں ہے، مگر پانی سے پوچھتے ہیں کہ اسے کیوں تشنگی کے لئے مفید تسلیم کیا جاتا ہے؟

حریف کاوش مژگان خوں ریز نئی زاہد — بدست آور رگ جانے و نشتر را تماشا کن!

بہر حال ہم پوچھتے ہیں کہ اس دعوت کے نتائج پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں روشنی کی برکتیں کسے معلوم نہیں۔ مگر پھر بھی آپ باربار دہرا دہرا کر کہے جائیں تو بہتر ہے، کیونکہ لوگوں نے تاریک غاروں اور تہہ خانوں کو اپنا نشیمن بنا لیا ہے۔ کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (اور اسی لئے ہم باربار دہراکر موعظت و تذکیر سے کام لیتے ہیں۔ تاکہ لوگ سوچیں اور غور کریں) ہماری دعوت دراصل دو حصّوں پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمان اپنے تمام اعمال میں جب تک کوئی عملی مذہبی تبدیلی پیدا نہیں کریں گے، محض سیاسی یا تعلیمی تغیرات و ترقیات اُن کے لئے سودمند نہیں ہو سکتیں۔

(۲) تعلیم، معاشرت اور سیاست میں ان کو بربنائے اتباع اقوام کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے، بلکہ بربنائے مذہب۔

پہلے حصہ کو ہم مؤخر رکھ کر سردست دوسرے ٹکڑے پر ایک مختصر بحث کرنی چاہتے ہیں۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے تئیں تعلیم قرآنی کے ہاتھ پر چھوڑ دیں:-

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اب دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم ایسا کریں، تو تعلیم، معاشرت اور پالیٹکس میں قرآن ہم کو کس طرف لے جائے گا؟ تعلیم میں ہم آج جو علوم و فنون جدیدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور جو مقصد انتہائی ہمارے پیش نظر ہیں، مذہب کی

راہ سے بھی وہاں تک پہنچ سکیں گے یا نہیں؟ اور اگر پہنچیں گے، تو خالص تعلیمی تحریک اور اس تحریک میں کیا فرق ہوگا؟ معاشرت میں اس کا ہاتھ ہمیں کہاں لے جائے گا؟ اور جو زندگی ہماری ہوگی، وہ بیسویں صدی کی معاشرتی ضروریات سے مطابق ہوسکے گی یا نہیں؟ پالیٹکس میں اس کی تعلیم کیا ہوگی؟ وہ غلامانہ محکومی کو فضیلت انسانی قرار دے گا، جیساکہ اب تک مسلمانوں کا حال رہا، یا آزادی و خود مختاری جمہوریت ومساوات کا ولولہ پیدا کرے گا، جس کی طرف موجودہ تغیرات کا عام رجحان ہے؟ اور پھر بالفرض تعلیم قرآن واسلام کی راہ سے ہم نے ایک آزادانہ پولیٹکل پروگرام مرتب بھی کرلیا، تو اس میں مزیت وفضیلت کیا ہوئی، کیونکہ یہی شے ہم تو مذہب سے الگ رہ کر، یورپ کی موجودہ جمہوریت کے اتباع، اور ہمسایوں کی نظر سے بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

یہ سوالات ہیں، جن کا جواب دینا اس حیثیۂ بحث میں ضروری ہے لیکن تعلیم اور معاشرت سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ پالیٹکس کی شاخ پر نظر ڈالیں کیونکہ گو آج تک مسلمانوں کی اصلاح پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا، کہ تعلیم اور معاشرت کی اصلاح مذہب کی راہ سے شروع کی گئی ہو، مگر تاہم چونکہ نئے مصلحین کا سرمایۂ اصلاح اب تک صرف تعلیم ہی رہا ہے۔ اس لئے گاہ گاہ ان کے ایوان تجدید میں بر بنائے مصالح چند در چند، مذہب کو باریابی کی عزت دیدی جاتی ہے۔ اور چنداں بے التفاتی پر اصرار بھی نہیں ہے مگر مسلمانوں کی جیب پر اب تک مذہب کی حکومت کچھ نہ کچھ باقی ہے اور

اس صید کے لئے جذبے کے جال میں سب سے زیادہ پرکشش مذہب ہی کا ہے۔

واعظین و مصلحین حال میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر اسلام و قرآن کے استغراق و انہماک سے بالکل عدیم الفرصت رہتے ہیں، اور قرآن کریم کے حامی تعلیم " "دین فطری اور" مصلح اخلاق و معاشرہ" ہونے کے بہت سے دلاویز اسباق ان کے نوک زبان ہیں۔ بعضوں پر تو کانفرنسوں کی خانقاہوں میں جب ہیجان جذبۂ قومی سے عالم تواجد و ترقص طاری ہوتا ہے، تو "فطرۃ" اور "اسلام" کا پردۂ بیگانگی و تعین بکلی مرتفع ہو جاتا ہے، اور عالم اتحاد کے مشاہدات سے بے خود ہو کر "الاسلام ہو الفطرۃ، و الفطرۃ ہی الاسلام" کا ترانۂ وحدت گانے لگتے ہیں:-

یارب زسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

اس میں شک نہیں کہ اسلام ایک دینِ فطری ہے اَلَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اور تمام عالم میں کوئی انسانی فطرت ایسی نہیں ہے جو اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ لیکن اگر انسانی خلقت کے بعض نمونے ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جیسے اس دینِ فطری کے ان نئے مصلحین و واعظین کے ہیں، تو پھر تو اسلام کی فطرت کے مقابلے میں شکست تسلیم کر لینا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض انسانوں کی فطرت اسلام سے اس درجہ متبائن و متضاد واقع ہوئی ہے، کہ آج تک ان کی فطرت اعمال کے ساتھ یہ

دینِ فطری ایک لمحے کے لئے بھی جمع نہ ہو سکا۔ اور گو وہ یورپ کے معترضین اسلام کو نازک فلسفہ، اور رموز کے دقائق فطریہ سمجھانے کے لئے پورے مستعد ہیں، مگر سوءِ اتفاق سے اس فلسفہ و اسرار فطرت کو کبھی اُن کے ایوان اعمال میں باریابی کی عزت نصیب نہیں ہوئی: بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ (ان لوگوں کے دل اس دینِ فطری سے غافل ہیں اور ان کے دوسرے اعمال ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں)

اب ہم صرف اس حصہ بحث پر نظر ڈالتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے آیندہ کے لئے اپنا پولٹیکل پروگرام مذہب کی بنا پر قرار دیا، تو ایک خالص پولٹیکل تحریک کے مقابلے میں کیا نتائج مرتب ہوں گے؟

اتباعِ شک اور اتباعِ یقین

اولین اور بنیادی شے تو یہ ہے کہ اگر ایک "راہ یقین" کی دعوت آپ کو پکار رہی ہے، تو آپ "شک" اور "ظن" کی طرف کیوں دوڑتے ہیں؟ وہ پالیسی جو محض انسانی اتباع اور نظیر کی بنا پر قائم کی جائے گی شک اور گمان ہوگی، کیونکہ انسانی دماغ کا ہر خیال شک ہے، خواہ اس کا نام محصور علم ہو، یا محدود تجربہ، اور یقین کا سرچشمہ اگر کوئی ہے، تو وہ "اسلام" یا مذہب حقیقی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر جگہ کفر و ضلالت اور الحاد و دہریت کو "شک" اور "گمان" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ انسانی دماغ کی تنہائی

سرحد میں بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو یقین کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک ملحد فلسفی ہر چیز میں شک کرسکتا ہے کہ یہ کیونکر ہے، لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ نہیں ہے، تو نفی کے لئے حکم یقینی کہاں ہے؟ تو اس کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر مذہب ایک یقین کی دعوت لے کر آتا ہے، وہ حقائق اور وجود میں شک نہیں پیدا کرتا، بلکہ حقائق کے لئے ایک یقین اپنے ساتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ:

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (١٢:١٠٨)

یہ ہے میرا طریقہ کہ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اس یقین پر، جو مجھ کو اور میرے ماننے والوں کو طریق الٰہی پر ہے۔

اس نے ہر جگہ منکرین تعلیم الٰہی کو سب سے بڑا الزام یہ دیا ہے:

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا

ان کے پاس کوئی علم ویقین نہیں، سوا اس کے کہ شک اور گمان میں گمراہ ہو رہے ہیں، حالانکہ شک یقین کے مقابلے میں کب ٹھہر سکتا ہے؟

دوسری جگہ کہا:

هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ

کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے، جو ہمارے آگے پیش کرسکو، حقیقت

وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶ : ۱۱۰)

یہ ہے کہ کوئی نہیں، صرف اپنے واہمہ پر چلتے ہیں۔

بلکہ اگر قرآن کریم پر تدبر و تفکر کی نظر ڈالی جائے، تو ثابت ہوتا ہے کہ "کفر اور شک" اس کی اصطلاح میں ہم معنی الفاظ ہیں، اور وہ کفر کو ہر جگہ شک پرستی سے اور اسلام کو یقین و عمل سے تعبیر کرتا ہے (لیکن یہ اس بحث کا موقع نہیں)

پھر سوال یہ ہے کہ اتباع و پیروی کی مستحق وہ تعلیم ہے، جو یقین اور اعتقاد بخش ہو، یا وہ جس کا تمام تر ماحصل شک اور ظن پر ہو؟

اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ، اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى؟ فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ؟ وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا، اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْــٴًـا، اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۱۰ : ۳۵)

جو حق اور یقین کی راہ دکھلائے، وہ زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ انسان، جو خود کسی راہ دکھلانے والے کا محتاج ہے؟ تم لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے حکم لگاتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے وہم و قیاس کی اٹکلوں پہ چلتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہم، یقین کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔

عدم تغیر و استقلال رائے

ہم نے کسی گذشتہ نمبر میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ایک الیی پولیٹیکل

پالیسی تیار کرنی چاہیئے، جو کبھی متغیر نہ ہو، اور جس کی بنیاد ایک محکم عقیدہ ہو نہ کہ بعض خارجی اسباب۔ لیکن مذہب کے سوا اور کون سا اعتقاد ہو سکتا ہے، جو تغیر و تبدل سے محفوظ ہو؟ انسانی آراء و قیاس میں تغیر لازمی ہے، کیونکہ وہ ظنون و اوہام ہیں، اور خارجی اسباب ذلل کے تابع، لیکن احکام الٰہیہ کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ ایسی یقینیات ہوں جن میں کبھی تغیر نہ ہو سکے۔ اگر کوئی مذہبی حکم متغیر ہو سکتا ہے تو وہ اس کا مستحق ہی کب ہے کہ اس کو مذہب کے لفظ سے تعبیر کیا جائے؟ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

پس اگر مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی اُن کے مذہبی اعتقاد پر مبنی ہوئی تو جب تک اُن کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد باقی ہے، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اُن کے ہمسایوں کی پالیسی بدل جائے گی مگر اُن کی پالیسی بدل نہ سکے گی! کیونکہ جس رہنما کے ہاتھ میں اُن کا ہاتھ ہوگا، اس کی راہ ایک ہی ہے۔ اگر گورنمنٹ کی پالیسی میں تغیر ہو، تو اس کا بھی اُن پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ انسانی حکومتوں کے اصول حکمرانی ہی نہیں بلکہ سرے سے حکومتیں بھی بدل جائیں تو بھی اسلام نہیں بدل سکتا۔ اور اسلام نہیں بدل سکتا، تو پھر اس سے ماخوذ اور اس پر مبنی اعتقاد بھی نہیں بدل سکتا۔

تصادم احزاب و تزاحم آراء

اب تک مسلمان ملکی ترقی اور آزادی کی تمام تحریکوں سے فخر کرتا

الگ رہے۔ اس لئے ان کو پولیٹکل زندگی کے سفر کی کوئی منزل پیش ہی نہیں آئی
یہ منزلیں ابتدا سے طے شدہ اور مقرر ہیں، اور ہر محکوم قوم جو سیاسی
زندگی حاصل کرنا چاہے گی، ضرور ہے کہ اُن سے ایک بار گذر جائے۔ منجملہ
ان منازل کے ایک نہایت خطرناک منزل پولیٹکل مطالبات کا اصولی اختلاف
ونزاع، اور اس بنا پر مختلف پارٹیوں کا قیام ہے۔ بغیر اس منزل سے
گذرے اس راہ کو طے کرنا تاریخ کے تجربے اور موجودہ واقعات کے
مشاہدے کے لحاظ سے تقریباً محال ہے۔ ملکی آزادی کی خواہش کو
جب دلوں میں پیدا ہونے اور نشو ونما پانے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا،
تو پھر آپ کے پاس کوئی مقیاس الحرارت نہیں ہے، جس سے ہمیشہ اس حرارت
دماغ سوز کی ڈگری کا خط دیکھتے رہیں۔ پولیٹکل زندگی مختلف طبائع میں
مختلف قسم کی صلاحیت پاکر مختلف درجے کی حرارت پیدا کر دیتی ہے، اور
اس لئے پولیٹکل جدوجہد کے شروع ہوتے ہی مختلف جماعتیں قائم ہو جاتی
ہیں۔ سب سے بڑا نزاع ملکی آزادی کی آخری منزل کی نسبت ہوتا
ہے، کہ وہ کیا ہو؟ ایک جماعت خالص جمہوری اعتقاد پر قائم ہو جاتی
ہے، دوسری جمہوریت کو شاہی اقتدار کے ساتھ قائم رکھنا چاہتی ہے
ایک جماعت غیر ملکی حاکموں کے زیر سیادت خود مختار ملکی حکومت
پر قناعت کر لیتی ہے، دوسری جماعت ملک کو صرف ملکیوں کے لئے دیکھنا چاہتی
ہے، اور اس لئے اس کا نصب العین صرف حکومت خود اختیاری ہی
نہیں بلکہ اغیار و اجانب سے ملک کو خالی کرنا بھی ہوتا ہے اور اگر دور نہ جائیں

تو اپنے برادران ملک کی پولیٹیکل جدو جہد میں اس کی مثال آپ دیکھ سکتے ہیں
اس نزاع احزاب، اور اختلافِ مقاصد کا سیاسی زندگی کے ساتھ
ساتھ پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ طبیعت انسانی کے طبیعی جذبات
حرص و قناعت، اعتدال و سختی، اور شدت و نرمی کا پولیٹیکل ظہور ہوتا
ہے، اس لئے بلا استثنا، دنیا کے سیاسی جدو جہد کے عہدِ قریب میں
کوئی قوم اس منزل سے گذرے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ اختلاف و نزاع
جس درجہ ناگزیر نظر آتا ہے اس سے زیادہ اس کی مضرتیں واضح ہیں۔
سب سے پہلا مضر نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ملکی آزادی کے حملے سے بچنے کے لیے
یہ نزاع حکومت کے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈھال بن جاتا ہے اور حملہ آوروں
کا باہمی نفاق حریف کو فرصت دیدیتا ہے کہ جنگ کے نتیجے سے محفوظ ہو جائے
ہندوستان کا موجودہ پولیٹیکل سکون اسی کا نتیجہ ہے، اور مصر میں "حزب الوطنی"
کی تحریک اسی لئے بار آور نہیں ہو سکتی کہ وہاں کی ماڈریٹ پارٹی (حزب الامۃ)
کو انگلستان نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور آزادی کی ایک تلوار
سے دوسری تلوار کے دو ٹکڑے کر دئے۔

مسلمان اگر پولیٹیکل جدو جہد کا سفر شروع کرنا چاہتے ہیں (اور
افسوس کہ اب شروع کرتے ہیں) تو اُن کے لئے بھی اس منزل سے گذرنا ضروری
ہے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی پولیٹیکل زندگی کو مذہب سے وابستہ
کر دیں اور جس راہ کو اختیار کریں اُسے اپنا ایک مذہبی حکم سمجھ کر اختیار کریں تو اسلام
کے خوارق سے بعید نہیں کہ وہ ان کو ان موانع راہ سے بالکل محفوظ کر دے اور

وہ اس امن و سکون کے ساتھ راہ سے گزر جائیں کہ سیاسی جدوجہد کے کلیات میں ان کا وجود ایک مثال مستثنیٰ ہو۔

ہم نے کہا کہ کچھ بعید نہیں، لیکن غور کیجئے تو ایسا ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ جب مسلمان اپنی پولیٹیکل جدوجہد کو محض سیاسی ولولوں سے نہیں، بلکہ اپنے اعمال دینی کی طرح شروع کریں گے، تو ان کی زندگی اور اعمال احکام دینی کے تحت میں آکر بالکل محدود و متعین ہو جائیں گے۔ خلاف نزاع تو جب ہو جب انسانی دماغ کو اس میں دخل ہو۔ مذہبی احکام تعبد میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُن کا پالٹیکس مذہب کی حکومت میں آجائے گا۔ وہ خود مختار نہ ہوگا کہ اپنے لئے مقاصد اور اس کے حاصل کرنے کے لئے وسائل ڈھونڈھے، بلکہ جو ایک ہی مقصد، اور ایک ہی طریق حصول مقصد، اس کو مذہب بتلا دے گا، مجبور ہوگا کہ صرف اسی میں محدود رہے۔ جس طرح ایک مسلمان نماز پڑھتا، اور روزہ رکھتا ہے، بالکل اسی طرح ایک سیاسی مقصد کو حکم الٰہی سمجھ کر تلاش کرے گا۔

الجہاد فی سبیل الحریت

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (۳:۱۷۵)

کسی سے مت ڈرو ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو!

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وقت میسر
اک نعرہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔

اے یاران مجلس! بہت سے مالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جھکنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر اور معبودوں کو پوج رہے ہو تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے پیشرووں نے گھڑ لئے ہیں؟ حالانکہ خدا نے ان کے

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ؀ لے کوئی سند بھی نہیں۔ اے گمراہو یقین کرو کہ تمام جہان میں حکومت صرف اس ایک خدا ہی کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اُسی کے آگے جھکو! یہی دینِ اسلام کا سیدھا راستہ ہے لیکن اے وائے کہ اکثر لوگ ہیں جو نہیں جانتے۔

تاریخ آزادیٔ ہند جو لکھی جائے گی

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی یقیناً ایک دن آئے گا، جبکہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور تیرہ طالع قوم، جو ہمیشہ ملک کی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک بہترین کل رہی!

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ، جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے چلانے والے

اُن کے ہاتھ میں اپنے گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت، اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اُٹھا سکتی تھی ایک معمول، جو مسمرائزر کے ارادہ پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل، جو صرف زمین کے لئے بار ہو۔ ایک درخت، جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو۔ ایک پتھر، جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دئے ہل نہ سکتا ہو۔ اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ، جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۸۴ : ۲۸)

اُن کے پاس دل ہیں، مگر سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ ان کی مثال چارپایوں کی سی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ وہی ہیں جن کو غفلت کی سرشاری نے نہایت سے محروم کر دیا ہے۔

اسلام کی تذلیل کا ایک درد انگیز منظر

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جو آہ تم آہ! کہ مُسلم تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی۔ جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے۔

جو اس سے لئے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے، نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے۔ جو اس لئے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں یہی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں پڑی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردے، نہ اس لئے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنالے۔ جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی۔ تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے، نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے۔ جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا تاکہ وہ اٹھائے، نہ یہ کہ وہ خود خاک ذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اس ملتِ حنیفی کی پیرو تھی، جو دنیا میں صرف اس لئے ہے کہ حاکم ہو، نہ اس لئے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے، جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب و اقدس میں نہیں ہے؟ جو "مسلم" تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی جو اوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجود زبوں سے اس نے روکا۔ جو مسلم تھی، پس چاہیے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں، کیونکہ اس کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لئے ہے پیچھے رہنے کے لئے نہیں۔ وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲: ۱۴۷)

اور اسی طرح ہم نے مسلمانوں کو درمیانی قوم بنایا تاکہ وہ تمام انسانوں کی ہدایت کے شاہد ہوں اور ختم المرسلین اُن کے لئے شاہد ہو۔

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۲۲: ۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو حق جہاد کرنے کا ہے اُس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لئے چن لیا۔ پھر جو دین کہ تم کو دیا گیا ہے وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے، جس میں تمھارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہی ملت تمھارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے۔ اور اس نے تمھارا نام "مسلمان" رکھا ہے۔ گذشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمھارے لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتے کو مضبوط پکڑ لو۔ جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ۔ وہی تمھارا ایک آقا اور مالک ہے۔ پھر جس کا خدا مالک اور حاکم ہو، اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار۔

دماغ سوچنے کے لئے ہے نہ کہ غفلت کے لئے۔ پس تمھارے پاس دماغ ہے

تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمھاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو کہ اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے، میری روح بے چین ہے، میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں، اور میرے ہیجان افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آگیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شئے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آرہی ہے، میں سُن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے؟ آہ! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں۔ مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دین قویم کے پیرو، خطاب اسلام سے متصف، اور امانت الٰہی کے حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لئے ہو تاکہ نڈر ہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خود مختار رہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد رہو، بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استعباد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لئے ہو کہ تم جان فروش ہو، تاکہ راہ حق میں سر بکف ہو۔ پھر یہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں، لیکن اے بدبختو! تم ان سے محروم ہو۔ یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشائے عقل سوز ہے؟

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

تاریخِ ہند کا ایک خاص باب

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لئے بھی ایک شرف وعظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو، اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لئے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا، ہندوؤں نے اُس کے لئے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اُٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

افسانۂ استبدادِ ہند

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا، اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہوچکے تھے، ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جارہی تھی، اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دئے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے، مگر آبپاشی کے لئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اُگلے زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ تم وفادار ہو، مگر اسلحہ کو چھونے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار (۷۰۰۰۰) سُرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جارہی تھی، مگر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور

حفظ صحت کے انتظام سے محروم تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں، اور جو راہ اپنے لئے باز ہے وہی سب کی آمد کی منتظر، لیکن جب پاؤں اُٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی، تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹّی کا پُتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے، جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اُٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لئے وقف کر دیا لیکن عین اُس وقت جبکہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے، بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لولہ لنگڑا بنا دیں۔ جبکہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں جادو کا ایک منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "وقت نہیں آیا" اور یہ اُسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے اُن کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، پس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روک بن کر پڑے تھے۔

مسلمانوں کے ملکی کارنامے

اس کے بعد وہ آنے والا مؤرخ، جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل

گورنمنٹ تھی، چنگیز خاں کا تخت قہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا، اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو "مسلم" تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے، لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی، تو صرف ہندوؤں قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے، کیونکہ انھوں نے پالیٹکس کو شروع کیا اور پھر پالیٹکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے یہ سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں، یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے روئیں۔ اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں، بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے! ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۷: ۱۷۵)

مسلم لیگ

بے شک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب وطاعت ہونے کا فتوےٰ دینا پڑا، لیکن کیوں کر؟ اپنی قوت سے، اپنے

دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے؟ نہیں بلکہ

آن ہم لسبی غمزۂ مردم شکار دوست!

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے، اب انھیں کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جاکر اُن کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بناکر اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پُتلا بنا کر اُس کے سینے کی پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے، تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلاکر تالی بجائے، تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟ نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالٹیکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی، جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو! تم نے کی۔ تمھارا وجود دیکھ سیاست کی تحقیر، اور تمھارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بتکدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدہ کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔ تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کود رہے تھے تاکہ اور خسف و غرق ہو، لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے، پر اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا۔ ضَلُّوا فَاَضَلُّوا فَوَیْلٌ لَّهُمْ وَلِاَتْبَاعِهِمْ۔

حریفان رہِ دیر کردند گم ثمَّ وَلَّی لَھُمْ ثمَّ وَلَّی لَھُمْ
بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

کہ سوال چھت کا نہیں بلکہ اُن اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے، دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں یا جس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اولین گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُمنگ، اپنے جوش، اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارہ چشم اور جنبش دستِ دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالیٹکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا۔ اور راہ مقصود سے باز رہنے کے لئے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا، اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اس خمار کے لئے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا۔ اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے۔ لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہوگی، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان و کرم پر اعتماد ہوگا۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوقِ قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہیے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو۔ تم درختوں کے سائے

میں آرام وراحت لیتے ہو لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تمھارے باورچی خانوں
میں کون سی شے جلتی ہے؟ وہ بھی درخت ہے، لیکن جو درخت اپنی قوت نشو و
حیات سے محروم ہو جاتا ہے اس کو کاٹ کر چولھے ہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔
پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ۔

ملک کی غلامی کے لئے مسلمانوں کی قربانی

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے
والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال
کہ "تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی، اس لئے تمھارا پالٹیکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں
سے اپنا غصب کردہ حقوق چھین لو، غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت
کی چال تھی؟

وہ رہزن اور پھر ایسے کمیں سے

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے، جبکہ تم اس
قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو؟ یاد ہوگا کہ ہم نے ایک
بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہندوستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ
کو اپنے فوائد کے استحکام کے لئے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی، کہ کوئی ایک
قوم ملک کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی اُمیدوں کی
قربانی کے خون سے اس کے اغراض کے درختوں کو سینچے۔ مسلمانوں نے خود
اپنے تئیں اس قربانی کے لئے پیش کر دیا، اور جس بوجھ کے اُٹھانے سے ہندوستان
کی تمام قوموں نے انکار کر دیا تھا، اس کے لئے اول روز خود ہی اپنی گردن پیش

کردی کہ:

بنشیں درد دل ویرانہ ام اے گنج مراد!
کہ من ایں خانہ بسودائے تو ویراں کردم

اَلَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ، فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند نہ کر دیا ہوتا، تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسو روتے۔ وہ دیکھتے کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے "ہندو مسئلہ" ہو گیا ہے، اور مسلمانوں کو مِنْ حَیْثُ الْقَوْم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ "ہاؤس آف کامنس" میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر "مسئلہ ہند" کے معنی "ہندو مسئلہ" کے ہیں۔ حالانکہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمے داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی، تو اے اپنے تئیں بھولنے والو! تمھارے سر تو خدائے ذوالجلال کی طرف سے تھی! دنیا میں صداقت کے لئے جہاد، اور انسانوں کی انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ بس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو، اور پھر اپنے آپ کو بھلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمھارے لئے جگہ نہیں، فَیَا حَسْرَتَا! وَیَا وَیْلَتَا!

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۵۹: ۱۹)

اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے خدا کو بھلا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول گئے۔ وہ یقیناً فاسقوں میں سے تھے۔

جمود حرکت نما

ممکن ہے کہ آپ فرمائیں، یہ قصہ طویل اب داستان بے وقت ہے کیوں کہ درحقیقت تمام پچھلی باتیں بھلائی جا چکی ہیں۔ غلطیوں کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کی ضرب محکم نے ذکر فی الحقیقت آغاز عہد برطانیہ سے لے کر اس وقت تک ایک سب سے بڑی انسانی خدمت ہے جو اس نے انجام دی) ان ہاتھوں کو بھی جو شل ہو گئے تھے بیٹھو تک پہنچا دیا ہے کہ چوٹ سخت لگی ہے۔ خود اب لیگ پچھلی غلطیوں کی تلافی اور آئندہ کی اصلاح پر ملتفت ہے۔ مانا کہ اس کا سر برسوں بادۂ غرور و کبر سے سرشار رہا، مگر اس عجز خمار کو بھی تو دیکھئے کہ اب قومی خواہشوں کے آگے

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

آپ نے کہا کہ اولین شئے لیگ کے نظام کی تبدیلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت بہتر۔ آپ نے شکایت کی کہ اگر ہلال احمر فنڈ کی فکر نہ کی تو لیگ پھر کس مرض کی دوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ اب کے یہ بھی لیجئے۔ آپ کا بڑا رونا یہ تھا کہ سفر بے منزل، اور سعی بے مقصود ہے، انھوں نے کہا کہ اس سے بھی انکار نہیں اب کے "نصب العین" کی جستجو میں بھی نکلیں گے۔ ابھی سامنے کی بات ہے کہ لیگ کے التواء پر آپ کو بہت غصہ آیا تھا، تجویزیں تھیں کہ ایک علیحدہ کانفرنس کا انعقاد ہو، انھوں نے معاً کہا کہ اور طرف کیوں جلتے ہیں کہ یہاں ایک صحبتِ خاص اس لئے بھی تیار ہے۔ پھر جب حالت یہاں تک رو با صلاح ہو چکی ہے تو اب پچھلے گلے شکوے کا کون موقع

ہے؟ اب تو پرانی باتوں کو تہہ کیجئے اور اُمیدوں کا دروازہ کھولئے کہ مدتوں کے دبے دبائے ارمانوں کے نکلنے کا وقت آگیا۔

دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم
از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

لیکن میں عرض کروں گا کہ ذرا صبر کیجئے اور زبانوں کو نہ روکیے کہ دراصل شکوے شکایت کا وقت پہلے نہ تھا، وقت تو اب آیا ہے۔ ہم بھی اسی روز آزمائش کے منتظر تھے۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ:

حکم اخیر کی تھی توقع بروز حشر
باقی رہا نہ دن ہی جب اظہار ہو چکا

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

اول تو:-

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

اور پھر یہ جو کچھ ہے صرف الفاظ ہیں جن میں معانی کا نزول باقی ہے محض جستجو کے ارادے سے منزل نہیں مل سکتی، آپ سرخی اور چونا مہیا بھی کرلیں، پھر بھی مکان نہیں بن سکتا جب تک کہ معمار نہ ہوں۔ شاید لیگ کی یہ نئی ادائیں توبہ شکن ضرور ہیں، لیکن ابھی ایسی نہیں ہیں کہ واپس لیا ہوا دل پھر اس کے

حوالے کردیں۔

کھلے کیا دل در ودیوار کے آثار باقی ہیں
ہوا ہر چند گھر ویران صحرا، پھر بھی صحرا ہی

البتہ بعض خام کارانِ ہوس پیشہ سے کھٹکا ضرور لگا ہے کہ کہیں اِن صبر آزما اداؤں پر لوٹ نہ ہو جائیں۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجیو مرے دعوئے وارستگی کی شرم

نظامِ ترکیبی کی اصلاح اور نصب العین کی جستجو یقیناً ازالۂ مرض کے لئے اصلی علاج کی تلاش ہے۔ مگر تلاش کا ہونا ہی صحیح تشخیص اور مفید نسخے کے مہیا ہو جانے کے لئے کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ تشخیص کی جستجو صحیح راہ پر ہو اور نسخہ جو تجویز کیا جائے وہ دفع مرض کا اصلی علاج ہو۔ لیگ اگر یہاں تک کے لئے راضی ہو گئی ہے تو زہے نصیب! لیکن ابھی یہ پوچھنا باقی ہے کہ کہئے کچھ بڑھ کے بھی ہمت ہو گی؟

راضی نامہ

اصل یہ ہے کہ لیگ کی طرف سے پوری مایوسی تھی اور ہے، جب تک کہ وہ اپنے تئیں اب امید کا مستحق ثابت نہ کر دے۔ قوم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ نہ صرف اہم امورِ سیاسیہ کے لئے، بلکہ ادنیٰ درجے کی سیاسی ضروریات کے لئے بھی لیگ بےکار ہے اور اس لحاظ سے سخت مُضر، کہ قوم کا آئندہ راستہ روک کر کھڑی ہے۔ پس عین اس وقت جبکہ صاف صاف یہ ہے کہ ہم لیگ کے

کالعدم یقین کر کے اپنی راہ ڈھونڈ رہے ہیں اور دل کے ایک نئے ٹھکانے کی فکر میں (الحمد للہ) کہ پہلے سے اچھی عالت میں ہیں، لیگ مکرر سامنے آئی ہے اور کہتی ہے کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ، اور اب پھر مجھی کو دیکھو اچھی بات ہے۔ پہلی پہر خواہ کیسی ہی بے مزہ گذری ہو، لیکن رات کا آخری حصہ تو ابھی باقی ہے، اور گو مرغ سحر کی چیخیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہیں، مگر ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ جو کچھ گذر چکا ہے دن تھا۔ اور در اصل شب وصل اب سے شروع ہوئی ہے۔

وصال پر ہے جو وصل، امتحان کر دیکھو
اسیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

اگر لیگ پھر ہمارے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ ہم میں اور اس میں ایک راضی نامہ ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اسے طلاق دے دی تھی لیکن اب پھر وہ آنا چاہتی ہے تو عقد رجعت سے انکار نہیں۔ البتہ اس کو تو اپنی غیرت کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ "حلالہ" کو منظور کریں۔

ہمہ غیری دمی گوئی بیا عرفی تو ہم
لطف فرمودی برو، کیں پائے رازفتار نیست

یہ راضی نامہ بالکل ایک منصفانہ معاہدہ ہوگا اور شرائط میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ لیگ پچھلی باتوں کو بھلا دے، اپنے گھر کو صحبت اغیار سے خالی کرے، اور ہم سے لگاؤ رکھنا ہے تو غیروں سے لگاوٹ چھوڑ دے

پھر ہم بھی دوسرے ٹھکانوں کی فکر چھوڑ کر اسی کے ہو رہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ معاہدہ آخری ہوگا، اگر پھر کبھی اغیار کی پرچھائیں بھی نظر آئی تو

بس لیجئے سلام، اپنا بھی وعدہ ہے کسی سے

اس کو بھی کھول کر کہہ دیں کہ صحبت غیر سے کیا مطلب ہے؟ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ سے غیرت عشق کے انتہائی مطالبات کئے جائیں۔ ہمیں اس سے کوئی چڑھ نہیں کہ گورنمنٹ سے پورے تعلقات رکھئے، کانگریس کی موجودہ حالت کی نظیر آپ کے سامنے ہے، اب تو گورنمنٹ خود اُمیدوں کی جرأت افزائی کر رہی ہے۔ لیکن تعلقات کے یہ معنی سمجھئے کہ اچھے وقتوں میں اپنے وقار اور متانت کے تحفظ کے ساتھ دو چار گھڑی ہنس بول لیا، یہ نہیں کہ

ہمہ شب شراب خوردن، ہمہ روز خواب کردن

شرائط صلح، نصب العین

سب سے مقدم تر مسئلہ پولیٹیکل جد و جہد کے لئے ایک نصب العین کی جستجو ہے، اور اگر آپ کو زندہ رہنا ہے تو کسی مقصد بلند کی انگیٹھی سلگایئے جو ہر وقت آپ کے دل کو گرم رکھے۔ یہ بار بار کہا جا چکا ہے۔ کوئی قوم اپنی جد و جہد میں اصلی سرگرمی اور جذبات و قویٰ کا ایثار نہیں کر سکتی، جب تک اس کے سامنے ایک جاں طلب نصب العین نہ ہو، اور اب آپ کو کیا سمجھائیں کہ آزادی تو وہ مقصود ہے جس کا تصور بھی دل کی زندگی کے لئے کافی ہے۔

رہے پہلو میں وہ یا اس کا خنجر   غرض دل ٹھہرتا ہے ہم نشیں سے۔

لیگ تلاش میں نکلی ہے تو اس کو بھٹکنا نہیں چاہیے۔ ہندوستان میں سیاسی نصب العین کا سوال ایک ہی ہے۔ گو اس بارے میں ہماری راہ عام شاہراہ سے الگ ہے، اور ہم اس چیز کو دوسری طرف سے آکر لینا چاہتے ہیں، لیکن لیگ سے اس کی توقع لاحاصل ہوگی، پس اس کو چاہیئے کہ اس ایک ہی نصب العین کا اعلان کردے، کہ "انگلستان کے ماتحت ہندوستان کی حکومت خود اختیاری":

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یاد رکھو کہ یہ نصب العین جو ہم نے تجویز کیا، تو کوئی بہت اونچے درجے کی بات نہیں کیونکہ ہماری ہمت کا آشیانہ اس شاخ سے بھی بلند تر جگہ ڈھونڈتا ہے۔ تاہم یہی بہتر ہے کہ آپ "سلف گورنمنٹ" کو اپنا نصب العین سیاسی قرار دیں اور آج کے دن سے سفر شروع کردیں۔ اگر ایک دلکش منزل آپ کے سامنے ہوگی تو پھر سفر کی تکلیفیں بھی بھول جائیے گا۔!

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

تیس برس سے جو پیچ اس مسئلے کی نسبت پڑے ہوئے ہیں اُن پر ادھر بار بار لکھا جاچکا ہے۔ ہندوؤں کی مجارتی، مختلف عناصر کی باہمی رقیبانہ کشاکش، ہندو مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کے اثرات، ملک کی عدم تیاری، مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں باہر کی حکومت کی بہتری اور اسی طرح کے وہ تمام وساوس و نزعات نفسانیہ، جو مسلمانوں کے دلوں

میں جاگزیں کئے گئے تھے ہمیں حسن ظن ہے کہ اب بھلائے جا چکے ہیں۔ سلف گورنمنٹ اسی لئے نہیں مانگی جاتی کہ ملک کی استعداد اور عدم استعداد کا افسانہ دہرایا جائے۔ مقصود ایک نصب العین کو سامنے رکھنا، اور بتدریج اس تک پہنچنا ہے۔ ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لئے دل سے نکال دیجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شئے قوموں کی معنوی قوت ہے، جو اس کے اخلاق اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیتہ الٰہی، اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وکَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِیۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ اسلام کی طاقت کبھی بھی وابستۂ دام قلت و کثرت نہیں رہی ہے اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو، وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے لَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا، وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مومنین یہ تمام وساوس اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ اگر روز اول سے یہی ہوگیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین علیٰ کی طرف دیکھنے لگتے تو اور کسی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں ملتی، اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال و قتال میں صرف ہو رہی ہیں، اسی کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنئے کہ ایک بہت بڑا نکتۂ عمل کہہ رہا ہوں اور اپنے طرز بیان کا شاکی ہوں کہ اسرار و رموز کی باتیں بھی حسن و عشق کی

کی کہانی بن جاتی ہے۔ اپنے سامنے ایک جان ستاں جلوہ گاہ حسن پیدا کر لیجئے
پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ
کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی، اغراض پسندی، باہمی جنگ و جدال، انتشار
و فدویت فراموشی، اور ہر قسم کے اشغال ضلالت صرف اس لئے ہیں کہ
سامنے کوئی کشش نہیں، اور جس بلائے عقل و ہوش کو ہم دیکھ
رہے ہیں، آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔ جس دن ایک اچٹتی ہوئی
نظر بھی "آزادی" کے حسن پر پڑ گئی، پھر آپ خود بخود تمام قصے بھول
جائیں گے

وَيَسْمَعُونَ كَمَا سَمِعْتَ كَلَامَهَا خَرُّوا لِعَزَّةِ سُجَّدًا وَرُكَّعَا

اسی طرح سنی ہوتی جیسی کہ میں سن رہا ہوں تو معاً اس کے
آگے سجدے میں گر پڑتے۔

مشکلاتِ راہ

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں
کو بھی یہی نصب العین اپنے لئے تجویز کرنا چاہیئے۔ مگر مشکلات راہ سے گھبراتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے، نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہان
کو کون بدمزہ کرے؟ لیکن اب ہم ان سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے
نیچے اترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعہ اتار لیجئے پھر پوچھیں گے
کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

حریف صافی و دردی نئی، خطا ایں جاست — تمیز ناخوش و خوش میکنی، بلا ایں جاست

اے اخوان غفلت شعار، نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتل سیاست ہے، یہ مشہد آزادی وحریت ہے، آپ کا سی سالہ میدان لہو ولعب نہیں ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لئے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ یہ آپ سے کس کمبخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھئے؟ یہاں آئیے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں، حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے یہاں ہوس پرستوں کا گذر نہیں۔ اس میدان کے مرد وہ جان فروشان الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں، جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں۔

در مدرسہ کس را نرسد دعویٰ توحید
منزل گہ مردان موحد سردار ست

سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکریہ کے سجدے کرکے اپنے عیش کدوں میں چھپ جائیے گا، اور وہ آسمان سے ڈھونڈتی ہوئی آپ کے سامنے آموجود ہوگی! آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آئیے، لیکن آنے کا ارادہ ہی ہو تو اپنے دل وجگر کی طاقت کو ٹٹول لیجیے کہ اس طریق عشق کی شرطیں آپ کو معلوم نہیں۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریق عشق اول منزل است

غلامی کے پُتلے اور سیاست کی روح کا دعوے

آپ کے گزشتہ اعمالِ سیاست سامنے آجاتے ہیں، تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تمسخر کیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے۔ ہر خوشامد و غلامی کی غلاظت کا کیڑا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا نکلتا تھا اور دعوے کرتا تھا کہ میں مردِ میدان سیاست ہوں اور قوم کے پولٹیکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف، اتنی کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی ذراسی بے مہری بھی گوارا ہو، اس کا دعویٰ ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولٹیکل کارزارِ اعمال کے سپہ سالار ہیں۔ اور نکلے ہیں تاکہ اس معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں! اربابِ نظر ان ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے، ہنستے بھی تھے اور زمانے کی بوالعجبی پر روتے بھی تھے

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اللہ اللہ! جس متاعِ یوسفی کے لئے زلیخا آبادِ حریت میں تڑپتی ہوئی لاشیں اور کٹی ہوئی گردنیں بھی طلب کی جائیں تو لینے والے طالع پر ناز کریں کہ مفت ہاتھ آئی، اس کی قافلہ لیگ میں یہ ارزانی، کہ چند کھوٹے درہم ہاتھوں میں لے کر بولیاں بولی جاتی ہیں! وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۔

لے جائیے دکھلانے اُسے مصر کا بازار
خواہاں نہیں پر کوئی وہاں جنس گراں کا

اے بے خبرو! یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے۔ کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لئے ہیں، ایک بے روح لاش کے لئے نہیں ہیں۔ آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے، بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی پر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضرور ہے۔

اصلاح و تغیر نظام

آخر میں ہم چند الفاظ لیگ کے نظام کی تبدیلی کی نسبت بھی کہہ دینا چاہتے ہیں۔ نہیں معلوم کار فرمایانِ لیگ نے اس کا کیا مطلب سمجھا ہے، مگر ہم نے مدتوں سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے سوا چارہ کار نہیں۔ یاد رہے کہ لیگ کی اصلی بنیادی گمراہی اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔ دنیا میں تمام کاموں کے لئے تقسیم عمل کا اصول ہے، اور پھر ہر گروہ کے حالات مختلف، اور اس لئے ایک ہی کام کے لئے سب موزوں نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ پولیٹکل کاموں کے لئے بھی طبقہ خواص و امرا کی رہنمائی میں ہاتھ دیا جو سر سے لے کر پاؤں تک ہزاروں زنجیروں میں لپٹا ہوا ہے اور آپ سے بھی ملے گا تو انھیں زنجیروں میں جکڑ بند کر کے چھوڑے گا۔ اس کے پاس یا دولت ہے یا زنجیریں۔ تیسری شے نہیں ہے۔

پس اصولِ عمل یہ ہے کہ آزادی کے کام کرنے والے صرف آزاد

ہوں، اور پھر ان میں جو دولت کے ساتھ دماغ بھی رکھتے ہیں، وہ صرف اپنی دولت اور دماغ سے الگ رہ کر فائدہ پہنچائیں۔ امریکہ میں کارنیگی اور راک فیلر کے پاس بہت خزانہ ہے لیکن پھر یہ نہیں ہے کہ وہی امریکہ کے پریذیڈنٹ بھی ہوں۔

دراصل ان بزرگان خواص کا بھی اتنا قصور نہیں، جس قدر کہ آپ کا قصور ہے۔ آپ ان کو اپنے میں کھینچتے ہیں تو ان کو آنا پڑتا ہے، حالانکہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ ہم بھی اُن کی جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو وہ کر رہے ہیں۔ پس لیگ کی زندگی کے لئے ایک قدم کام یہ بھی ہے کہ وہ اس امر کا قطعی فیصلہ کر دے، اور اپنے پالیٹکس کی باگ دولت کے ہاتھ سے نکال کر دماغ کے سپرد کر دے۔ جس شخص کو اپنی دولت اور جائداد کی حفاظت کی فکر سے رات کو نیند نہیں آتی اس کی صبح کو زبان کیا کھُلے گی؟

اسی اصل کی ایک شاخ یہ غلطی بھی ہے کہ لیگ نے پالیٹکس کا درخت علی گڑھ کی سرزمین میں بویا، حالانکہ وہاں پیشتر ہی سے جو درخت موجود تھا، اسی کی جڑ میں گھن لگ چکا تھا

قید کی بقیہ میعاد

وقت آگیا ہے کہ اشخاص کی جگہ قوم کے ہاتھ میں لیگ دے دی جائے اور طبقہ خواص کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا جائے کہ اب آئندہ کے لئے معاف کیجئے اور ہمارے قصوروں کو بخش دیجئے۔ ہمارے قصور واقعی بڑے سنگین ہیں، ہم نے آپ کی گاڑیاں کھینچیں، پھولوں کے ہار پہنائے، خود جانور بنے۔

اور اپنی رسی آپ کے ہاتھ میں دیدی ، یقیناً اس کی سزا بھگتنی تھی اور اچھی طرح بھگت لی ۔ اب اگر آپ کے دفتر تعزیرات میں چند سال سزا کے اور باقی رہ گئے ہیں ، ہماری قید کے پچھلے سالوں کے چال چلن پر نظر ڈال لئے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ قیدی اطاعت شعار ہو تو آخر کے چند مہینے معاف کر دئے جاتے ہیں ، بس آپ بھی رحم کیجئے ۔ ہم کو چھوڑ دیجئے اور حکم دیجئے کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں محض لیگ کے قواعد و ضوابط کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس مسئلے کا فیصلہ نہ ہو ۔

مسلم پولیٹکل فنڈ

ایک عملی سوال یہ ہے کہ اگر لیگ چند دولت نثار اشخاص کے بند غلامی سے آزاد کر دی جائے ، تو اس کے کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے لئے گا ؟ اب تک تو ایک حاتم وقت کی فیاضی تھی ، جس کی دریا دلی سے تمام خشک کھیتیاں سرسبز تھیں ، لیکن اگر آزادانہ اسپرٹ پیدا کی گئی ، نصب العین کا اعلان کیا گیا ، اور اصلی کاموں پر ملتفت ہوئے تو وہ تمام لوگ جو کلکٹر صاحب کے حکم کے بغیر پانی پینا گناہ سمجھتے ہیں ، یا جن کے نزدیک ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر کسی جلسے کی ریسیپشن کمیٹی کا صدر بننا حرام ہے ، قطعاً الگ ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ اور پھر اس دست کرم کی بخشش بھی موقوف ہو جائے گی جس کی خاطر اب تک سجدے کئے ہیں اور موت کو زندگی پر ترجیح دی ہے ۔

لیکن ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ایک لمحہ کے لئے بھی مانع کار نہیں

ہو سکتا۔ ہم نے جیسا کہ کلکتہ میں اپنے مکرم دوست جناب سید وزیر حسن صاحب سے زبانی بھی کہا تھا، اگر آج لیگ کی نسبت قوم کو یقین ہو جائے کہ وہ سر آغا خاں کی نہیں بلکہ قوم کی ہے، تو جس قدر روپیہ آپ کو مطلوب ہے ایک لمحہ کے اندر جمع کر لیجئے۔ آپ قوم کے جذبات سے جب کام ہی نہیں لیتے تو قوتوں کا ظہور کیونکر ہو؟

ہمارا خیال ہے کہ اگر لیگ اصلی راہ کی طرف متوجہ ہو تو اسے فوراً ایک قومی سیاسی فنڈ کے قیام کا اعلان کر دینا چاہیئے، جس کا مقصد یہ ہو کہ پولیٹکل کاموں کے لئے روپئے کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ لیگ کی ممبری کی رقوم بھی موجودہ تعداد سے المضاعف ہو سکتی ہیں اور چند دنوں کے اندر بغیر کسی دقت کے ایک ایسا مستقل مالی انتظام ہو جا سکتا ہے، جو سر آغا خاں کے موجودہ وظیفہ سے دوگنے تگنے تک پہنچ جائے۔ ہم کامل یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایک حقیقی پولیٹکل مجلس کی اعانت کے لئے تمام قوم تیار ہے، بشرطیکہ قوم محسوس کرے کہ یہ ہماری چیز ہے نہ کہ غیروں کی۔

فالجہاد فی سبیل الحریت

مضمون بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس بارے میں ہم اپنے خیالات کے ہجوم کے آگے مجبور محض ہیں۔ بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں، لیکن جو باقی ہے اس کی ترجمانی کو اپنی زبان کی جگہ آپ کے دل کے سپرد کرتا ہوں، اور صرف چند لفظوں کے عرض کرنے کی اور اجازت چاہتا ہوں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں اب خدا کے لئے بستر مدہوشی سے سر اُٹھا کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولئے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ "مسلم" ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔ کب تک اس دین الٰہی کو اپنے اعمال سے شرمندۂ عالم کیجئے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسلائے گا؟ اور خود نہ روئے گا؟ اور کب تک ہندوستان میں اسلام کی قوت کا خانہ خالی رہے گا؟ اگر مصائب کا تازیانہ غفلت کی ہشیاری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہو چکا ہے؟ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝

یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی، اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجیے وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اُٹھنا تھا۔ پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اُٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں، بیدار ہوں، اور

اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

جَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِيْنَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

فَبَشِّرْ عِبَادِيَ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰٓئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ

پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے اللہ کے ان بندوں کے لئے جو کلام حق کو کان لگا کر سنتے ہیں اور اس کی اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے ہدایت کے لئے کھول دیا ہے اور یہی عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

ادب

خط و کرب	الہلال ۱۷ ستمبر، یکم اکتوبر سنہ ۱۳ء
اکاذیب و شرمناک	الہلال ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۳ء
مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام	الہلال ۱۷ جون سنہ ۱۴ء

حظ و کرب

یا

لذت والم

(۱)

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ، وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

اس بارے میں اُن کے پاس کوئی علم اور ذریعۂ تحقیق و یقین نہیں۔ محض اپنے گمان پر چل رہے ہیں، اور راہ ظن و تخمین کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقتِ علم کے سامنے کچھ بکار آمد نہیں!

جمع اضداد کی لوگوں نے عجیب عجیب مثالیں دی ہیں۔ ایک زمانے میں مسیح رکنا کاشی کے اس مصرعہ پر تمام اساتذۂ عجم نے طبع آزمائیاں کی تھیں۔

روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است!

یہ تو خیالستان شعر کے افسانے تھے، مگر میں واقعی مثالیں دے سکتا ہوں۔ میرے سامنے مسلمانوں کا نیا تعلیم یافتہ فرقہ ہے۔

یورپ کی ترقیات نے عجائب، غرائب کو واقعات بنا دیا ہے۔ ضرور تھا کہ اس خصوصیت عجیبہ کا اثر اس کے پیرؤں میں بھی کرشمہ ساز عجائب ہوتا کہ یہ بھی اسی آفتاب تابندہ فضل و علم کے ذرے، اور اسی شجر کمال در فعت کے برگ و بار ہیں۔

گرچہ خوردیم، نسبتی ست بزرگ

ذرۂ آفتاب تابانیم!

ایک مرتبہ میں نے انھیں صفحات پر اس فرقے کے "جہل و علم" کے اجتماع نقیض پر مرثیہ خوانی کی تھی۔ احباب کرام کو یاد ہوگا۔ آج "تقلید و اجتہاد" کے اجتماع ضدین پر متحیر ہوں کہ ان هٰذا لشیئ عجیب!

ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ان کے پاؤں کو دیکھے تو یورپ کی نافہمانہ و کورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیریں پڑی نظر آتی ہیں، مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان کو ادعاء اجتہاد سے فرصت نہیں! اس سے بڑھ کر دنیا میں جمع اضداد کا اور کونسا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے، اور عین اس وقت جبکہ اس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں، اجتہاد فکر اور حریت رائے پر بے تکان لکچر دینا شروع کردے!!

ہمارے دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کا سرمایہ علم و دانش یورپ کی اسی سطحی تقلید سے زیادہ اور کچھ نہیں، تاہم جن چیزوں میں وہ اپنے ائمہ ہدیٰ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں انھی میں اولین شے اجتہاد تھی اور ضرور تھا کہ اس تقلید مجتہدانہ کا سفر اسی منزل سے شروع ہوتا۔ قینچی ہاتھ میں ہو تو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے کہ کسی چیز کو تراشئے۔ اس اجتہاد کی قینچی ہمارے چابک دست دوستوں کے ہاتھ آگئی تو بے کار بیٹھا نہ گیا۔ یورپ کے علم و عمل کے سر رشتوں پر تو کیا چلتی کہ وہیں کے کارخانے کی بنی ہوئی تھی، بس اپنے یہاں کی جو چیز سامنے آگئی وہی بلا تامل آلۂ مشق بنی۔ پھر اس کی روانی بے پناہ، اور اس کی کاٹ بے روک تھی۔!

سب سے پہلے مشرقی علوم و فنون، تہذیب و تمدن، اور اخلاق و آداب قومی سے اس کی آزمائش شروع ہوئی، اور تھوڑے ہی دیر میں سیکڑوں برسوں کے صفحات و اوراق قدیمہ پرزے پرزے تھے!

پھر غریب مذہب کی باری آئی۔ یہ کپڑا دبیز تھا، اس لئے مقراض اجتہاد کی روانی بھی زیادہ تیز و شدید تھی۔ پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا، جو پہلی آزمائش کا ہو چکا تھا۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے، نہیں معلوم اور کتنی گھڑیوں کا مہمان ہے؟

کچھ دنوں سے یہ قینچی زنگ آلودسی ہو گئی تھی۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ اب ایک نئی آزمائش شاید شروع ہونے والی ہے، اور مذہب و علم کے بعد "زبان" کا میدان جولانگاہ اجتہاد بننے والا ہے۔

ایک نیا فتنہ لغویہ!

تمہید کی ان چند سطروں میں جو اشارات کئے گئے ہیں، یہ حالت عام تعلیم یافتہ فرقے اور ان کے بعض صنادید دائمہ طریقت کی ہے، لیکن آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص یقیناً ایسے بھی ہیں، جن کو اس عام حالت میں حق امتیاز واستثنا حاصل ہے۔ اور ہماری عام مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نمایاں نشان اُمید رکھتے ہیں۔

میں اُن کی وقعت کرتا ہوں اور میری بہترین خواہش یہ ہے کہ ان کے ذریعے قوم کی وہ نامراد اُمیدیں زندہ ہوسکیں، جو ۴۰ سال سے نئی تعلیم کے ساتھ وابستہ رہی ہیں اور مایوسی کے سوا انھیں کچھ نصیب نہیں ہوا ہے۔ اس طبقے کی اس تعجب انگیز خصوصیت سے بھی، جو میرے لئے "جہل و علم" کے اجتماع نقیضین کی صورت میں ہمیشہ درد انگیز رہی ہے الحمد للہ کہ یہ نفوس معدودہ و قلیلہ مستثنیٰ ہیں۔ اور مطالعۂ علوم و ذوق تصنیف و تالیف سے نا آشنا ہیں۔

انھی چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر "عبد الماجد" بی اے بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی جو اب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔

لیکن مجھ کو نہایت افسوس اور رنج ہے کہ "خط و کرب" کے معاملے میں وہ ایک نہایت سخت غلطی میں مبتلا ہوگئے ہیں، اور بجائے اس کے کہ

جو مشورہ ان کو دیا گیا تھا، اس کو تسلیم کر لیتے۔ محض لاحاصل بحث مناظے میں پڑ گئے ہیں حالانکہ یہ معاملہ اُن کے بس کا نہ تھا۔ نہ تو ان کو اس بارے میں معلومات حاصل ہیں اور نہ ان کے مذاق و مطالعہ کی یہ چیز ہے۔ ان کو انگریزی سے ترجمہ کرنا چاہیئے اور بس۔ اصطلاحات کے باب میں واقف کاروں کے مشورے کو قبول کر لینا ہی بہتر ہے۔ انھوں نے زبان کے متعلق ایک عجیب و غریب اجتہاد کیا ہے۔ یہ اجتہاد جس قدر غلط ہے، اتنا ہی متعدی ہونے کی صورت میں زبان اردو اور ادبیات علمیہ کے لیے مضر بھی ہے۔ ان کی دوسری تحریر میں نے کلکتہ آکر پڑھی اور میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک فتنہ لغو یہ ہے، جس کی ابتدا کا بار وہ اپنے سر لے رہے ہیں اور خدا نہ کرے کہ وہ زیادہ متعدی ہو۔

علم و اخلاق میں اجتہادات ہو چکے ہیں۔ مذہب اسی خنجر اجتہاد کا قتیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے مشق اجتہاد کے لیے یہ میدان کافی تھے غریب زبان کو تو اب چھوڑ ہی دیجیئے۔ پچھلے اشغال اجتہادیہ میں اب بھی مصروفیت کی اور گنجائش نکل سکتی ہے۔ اگر اس نئے مرحلے کو ازراہ ترحم ملتوی کر دیا گیا تو کچھ آپ لوگ بے کار نہ ہو جائیں گے۔

مسئلہ وضع اصطلاحات اور خط و کرب

ایک وقت میں انسان کس کس چیز کو لکھے؟ مجھے اس بارے میں دفتر کے دفتر لکھنے ہیں مگر مجبور ہوں۔ میں آج پھر اپنے گذشتہ جلسے کو دہراتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اس مسئلے کو لوگوں نے اپنی ناواقفیت و عدم معرفت جانبہ

نساہلی کی وجہ سے جیسا کچھ مشکل سمجھ رکھا ہے ویسا نہیں ہے۔ گو مشکل ضرور ہے مگر اشکال سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں ہوتا۔

سردست حظ و کرب اور PLEASURE اور PAIN ہی کو ایک مثال قرار دیجئے اور کچھ دقت عنایت فرمائیے۔

میں نے اپنے دوسرے نوٹ میں حسب ذیل امور پر توجہ دلائی تھی۔

(۱) عربی میں لذت والم بعینہ انھی معنوں میں بولا جاتا ہے جن کی ابھی تلاش ہے۔

(۲) حظ کا لفظ لذت کے معنی میں بالکل غلط ہے۔ لغت میں بھی اور اصطلاح میں بھی، نیز اس کے معنی کو مفہوم ما نحن فیہ سے کوئی قرب و تعلق بھی نہیں۔ پھر کون سی مجبوری ہے کہ لذت والم کو چھوڑ کر حظ و کرب اختیار کیا جائے؟

(۳) عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جو فارسی میں آکر اپنے اسدو معانی لغویہ سے الگ ہو گئے۔ لیکن حظ فارسی میں بھی بمعنی لذت نہیں بولا جاتا۔ چنانچہ اشعار اساتذہ سے متحقق ہے کہ نصیب ہی کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۴) اردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبانوں پر ہیں، سب کی سب عربی ہیں۔ پس اردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر، اور اس لئے سند کے سلئے اردو بول چال

نہیں، عربی لغت و اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب ہے۔ اگر لوگ حظ بمعنی لذت بولتے ہیں، تو بولیں۔ شعر میں ہم بھی کہہ دیں گے لیکن علم النفس کے مترجم کو اس سے کیا تعلق؟

(۵) فرہنگ آصفیہ کے حوالے پر افسوس ہے۔

(۶) لوگوں نے اپنی ناواقفیت سے مسئلہ اصطلاحات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ فلسفہ میں ہر طرح کی عربی اصطلاحات مل سکتی ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ان تمام امور میں سے کسی ایک پر بھی توجہ نہیں کی، اور جب کہ آپ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی فکر میں سرگرم جواب ہوئے تو ان دفعات میں سے ہر دفعہ کے متعلق غلط فہمیوں ہی سے اپنے استقبال کا کام بھی لیا!

آپ نے اپنے جواب میں میری معروضات کی جس قدر تشریح کی ہے، وہی غلط ہے تا باصل بحث چہ رسد؟

امر اول کی نسبت آپ لکھتے ہیں:

"سوال یہ ہے اور صرف یہ ہے کہ PAIN اور PLEASURE کا صحیح ترمفہوم اردو میں کون سے الفاظ ادا کرتے ہیں؟ جناب کا ارشاد ہے کہ لذت و الم اور میرا خیال ہے کہ حظ و کرب۔ آپ اپنے پر دعویٰ عربی لغت سے حجت لاتے ہیں، میں اپنی تائید میں محاورہ ولغت کو پیش کرتا ہوں"

لیکن گذارش یہ ہے"۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی اس کے بعد

گذارشیں ہوں گی" کہ آپنے دعویٰ، حجت، لغت اور استشہاد کے لفظ کا خواہ مخواہ اصراف کیے جا گیا۔ یہاں نہ توجیح و براہین پیش کئے گئے ہیں اور نہ کسی استشہاد و استدلال کی ضرورت

ان چیزوں کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں کسی بحث میں کسی اختلاف کی گنجائش ہو۔ خط کے لفظ کے لئے نہ تو میں نے عربی لغت کا حوالہ دیا اور نہ کوئی شہادت پیش کی۔ خط کے معنی اس آسمان کے نیچے صرف ایک ہی ہیں یعنی قسمت و نصیب اور بس۔ قلیوبی اور درایۃ الادب کا طالب العلم بھی اس کو جانتا ہے۔ ایک ایسی کھلی اور عام بات کے لئے مجھے کیا پڑی تھی کہ جوہری اور فیروزآبادی کی شہادتیں پیش کرتا؟ پس نہ میں "حجت لایا ہوں" اور نہ دعوے کی کوئی اصطلاحی شکل درپیش ہے۔

میں قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آپ کو جو غلطی اصل مسئلہ میں ہوئی ہے وہ زیادہ سخت ہے یا جو متواتر و مسلسل غلط فہمیاں میری تحریر کے سمجھنے میں ہوئی ہیں، وہ زیادہ سنگین ہیں! تاہم میرے لئے تو دوسری صورت اب پہلی صورت سے زیادہ درد انگیز ہو گئی ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ "فرہنگ آصفیہ کے حوالے پر افسوس ہے اور کیا کہوں؟" اور اس طرح بلا ضرورت کسی کتاب کے متعلق جرح و تنقیص کو بہتر نہ سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ مگر آپ نے اس کا یہ مطلب قرار دیا کہ مجھ کو اردو لغت کے حوالے پر تعجب اور افسوس ہے!

سخن شناسی نہ دلبرا خطا اینجاست!

اب مجھ کو کھول کر کہنا پڑا۔ اصل یہ ہے کہ میں فرہنگ آصفیہ کو اردو کے لغت کے اعتبار سے بھی قابل سند کتاب نہیں سمجھتا، اور بالکل پسند نہیں کرتا کہ آپ کسی حوالہ و سند کے لئے اس کی ورق گردانی کریں۔

افسوس اس پر نہ تھا کہ اردو لغت سے کیوں استشہاد کیا گیا۔ افسوس آپ کی ناواقفیت پر تھا کہ فرہنگ آصفیہ کو اردو زبان کا معتبر لغت سمجھتے ہیں، اور اس طرح بے فکر ہو کر اس کا حوالہ دیتے ہیں گویا وہ ایک مسلم و معروف کتاب ہے!

آگے چل کر آپ نے "حظ بمعنی مفرد، حصہ لذت" کو اردو قرار دیا ہے، اور غیر زبان کے "ہندو متغیر المخارج والمعانی کے اردو ہونے کو ایک "ایسا نکتہ نادر و بدیع، تحقیق غریب و عجیب سمجھا ہے کہ میں اسے سن کر بے اختیار چونک اٹھوں گا، اور حیران و پریشان ہو کر شور مچانے لگوں گا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"آپ حیرت سے فرمائیں گے کہ خط تو عربی لفظ ہے اسے اردو کہنا کیوں کر جائز ہے؟"

یا للعجب! آپ کبھی تو مجھے غلط فہمیوں میں مبتلا دیکھ کر دستِ تحقیق و رہنمائی بڑھاتے ہیں، کبھی خود ہی اپنی طرف سے مجھے "حیران" فرض کر لیتے ہیں۔ الحمد للہ۔ نہ تو میں غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں اور نہ اُن حقائق غریبہ اور نکاتِ عجیبۂ لغویہ پر متحیر ہوں۔ بغیر کسی "حیرانی" کے ہر شخص جانتا ہے کہ ہر زبان میں باہر کے الفاظ اگر بہ تغیر مخارج و معانی من ہاں میں

شامل ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہی تغیر نئی زبانوں کو پیدا کرتا ہے اور اردو تو مختلف زبانوں کے الفاظ کے مجموعے ہی کا نام ہے جو الفاظ عربی و فارسی یا انگریزی، بادنیٰ تغیر رائج ہوگئے ہیں وہ یقیناً اردو ہیں۔ یہ کوئی "حیرانی" وسرگردانی کی بات نہیں۔ میں مدت سے اس "نکتۂ نادر" کو جانتا ہوں اور باوجود جاننے کے اب تک میں نے کوئی "حیرانی" اپنے اندر نہیں پائی ہے۔ البتہ میری "نئی حیرانی" یہ ہے کہ آپ صرف مقصد سے خواہ مخواہ اعراض کرتے ہیں اور دقت نظر سے کام نہیں لیتے۔ اس اصول سے ما نحن فیہا کو کوئی تعلق نہیں۔ اور تحقیق و معارف کے سفر میں بڑی چیز یہی ہے کہ مختلف راہوں کے حدود کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے اور ہر اصول کو اس کی اصلی جگہ ملے۔

یہی سبب ہے کہ میں نے "علم النفس" اور "زہر عشق" کا سوال پیش کیا تھا مگر اپنی نارسائی عرض مدعا پر متاسف ہوں کہ شرف استماع و فہم سے محروم رہا۔

آپ صرف اس پر زور دیتے ہیں کہ میں علم النفس کو عربی میں نہیں بلکہ اردو میں لکھ رہا ہوں اور اردو میں حظ لذت کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ پس میں لذت کو کہ عربی ہے اپنی اقلیم قبولیت سے خارج البلد کرتا ہوں اور اس کی جگہ "حظ" کو کہ اردو ہے، خلعت قبولیت سے سرفرازی بخشتا ہوں۔ اور اس ردو قبول مختارانہ اور عزل و نصب مجتہدانہ پر کسی کو اعتراض ہے تو "دعوائے اجتہاد" عام بول چال اور فرہنگ آصفیہ کی عدالت میں کی گئی ہے!

داور گاہے بنا فرمود داور ہے ہر سہ را
منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کردہ است!

اس مقدمے کا عاجلانہ ترتیب اور فیصلے کی جلدی تو قابل داد ہے شاید عدالت کے کاروبار میں ایک شئے انصاف نامی کو بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

آپ نے غلطیوں کا ایک الجھا ہوا مجموعہ سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ اصول بالکل صحیح ہے کہ اردو میں جو الفاظ دخلیہ موجود ہیں، وہ تغیر معانی یا تغیر حروف و حرکات و صورت کے بعد اردو ہو گئے۔ یہ بھی مسلم سہی کہ بول چال میں حظ لذت کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ تاہم آپ کی قائم کردہ عدالت میں جانے کی کوئی ضرورت پھر بھی پیش نہیں آئی۔ کیونکہ میرا سوال یہ نہیں تھا کہ الفاظِ عربیہ متغیرہ اردو کو اُن کے اصلی معانی لغویہ ہی میں استعمال کرنا چاہیئے اور ہماری بول چال کوئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ تھا" اور صرف یہ تھا" کہ اردو میں جب کسی فن کو لکھیں گے تو چونکہ اردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیرِ اثر اور بکلی تحت ہے، اس لئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑے گا اور جب اصطلاحات عربیہ سے کام لیں گے تو اس کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو عربی میں لئے جاتے ہیں۔ اصطلاحات دوسری چیز ہیں اور شعر و ادب دوسری شئے۔ اگر عربی میں ہم کو اصطلاحات نہ ملیں (لیکن نہ ملنے کا حق ادعا علم و تلاش کے بعد ہے نہ کہ پہلے) مثلاً بعض علوم حدیثہ و طبعیات جدیدہ کی شاخوں میں تو اس صورت میں ہم کو نئے الفاظ وضع کرنا چاہئیں لیکن ان کی بھی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اصل انگریزی اصطلاحات لے لیں یا اُن کی جگہ خود نئے الفاظ بنائیں۔ آخری صورت میں اگر عربی الفاظ سے مدد لی گئی، تو اس میں بھی عربی زبان و لغت کا لحاظ رکھنا ضرور ہوگا کیونکہ ہم اردو میں

علوم و فنون مرتب کر رہے ہیں۔" مثنوی زہر عشق نہیں لکھ رہے ہیں۔"
ذرا تامل کو کام میں لائیے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں بالکل مختلف حکم و حالت رکھتی ہیں۔ ایک مسئلہ تو عام طور پر اردو زبان میں الفاظ کے استعمال اور اُن کے معانی کے قرار دینے کا ہے۔ دوسرا علمی اصطلاحات کا۔ خدارا میرے مطلب کے سمجھنے سے اب زیادہ اعراض نہ فرمائیے گا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ دوسری صورت میں اردو اب تک تابع عربی ہے۔ اور عربی الفاظ کو عربی ہی کے متعارف معانی میں استعمال کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے "عام بول چال" کی سند بالکل بے معنی و بے اثر ہے۔

جس اصول پر آپ نے ازراہِ نوازش میری مفروضہ "حیرانی" دور کرنی چاہی ہے وہ پہلی صورت کے تعلق ہے، اور ہماری موجودہ صحبت صورت ثانی سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر آپ بحث صاف کرنا چاہتے ہیں تو اس پر غور فرمائیے۔ یہ بہت صاف بات ہے اور اصل راہِ فیصلہ و تحقیق۔ فرہنگ آصفیہ اور غیاث اللغات کی ورق گردانی میں بے کار وقت ضائع نہ کیجئے۔

(۲)

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:

" اگر آپ کے اصول کو وسعت دی جائے کہ ہر اردو لفظ کی "تحقیق" اس زبان کے لغت سے کرنی چاہیے جس سے وہ آیا ہے تو اردو کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟"

آپ نے تحقیق کا لفظ لکھا ہے۔ اور گو میں نے اس اصول کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا مگر واقعی ہر لفظ کی "تحقیق" تو اُسی زبان کی لغت سے کرنی پڑے گی جس سے وہ آیا ہے۔ یہ تو ایک قدرتی اور ناگزیر امر ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالباً یہاں آپ کا مقصود "تحقیق" نہیں بلکہ "صحت استعمال" اور "جواز استعمال" ہے۔ جلدی میں آپ تحقیق کا لفظ لکھ گئے ہیں۔

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ عام الفاظ اور مخصوص اصطلاحات علمیہ میں فرق کرنے سے اپنے تئیں معترض ظاہر کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ چاہیں تو اس فرق کو محسوس کرنا کچھ مشکل نہیں۔ میں ابتدا سے کہہ رہا ہوں کہ اردو کے عام الفاظ کا سوال نہیں بلکہ اصطلاحاتِ علمیہ کا ہے۔ میں نے کہیں یہ اصول پیش نہیں کیا کہ ہر عام لفظ کا استعمال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے اصلی زبان کی لغت سے بھی ان معانی میں صحیح ثابت ہو جائے۔ میری گذارش تو صرف "اصطلاحات علمیہ" تک محدود ہے اور اسی لئے "مثنوی زہرِ عشق اور علم النفس" کا سوال آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ آپ سنتے ہیں، میرے سوال کو دہراتے ہیں، اس کو ایک "ناقابلِ انکار حقیقت" قرار دیتے ہیں مگر پھر جواب نہیں دیتے! فیصلہ ہو تو کیونکر؟

آپ نے جس نکتہ "علم اللسان" کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر خود بخود میری

"حیرانی" کی علاج فرمائی پر متوجہ ہوئے ہیں، میں اس کو دو مرتبہ خود وکیل میں لکھ چکا ہوں جبکہ چند الفاظ عربی و انگریزی کی بحث چھڑ گئی تھی۔

ان دلائل و براہین واضحہ و بینہ کے بعد آپ نے اس بحث کا خاتمہ کر دیا ہے اور عدالت برخاست ہوگئی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"اصل مسئلہ ختم ہوگیا"

گر یوں ہی تو قاعدہ اچھا ٹھہر گیا

اگر کسی" مسئلہ کے ختم کرنے" کا یہی طریقہ ہے کہ اصلی فیصلہ طلب امور کو نذر تجاہل و تغافل کر کے اختتام بحث کا اعلان کر دیا جائے تو پھر بحث میں صرف وقت کرنے سے کہیں بہتر خاموشی اور اعراض ہے۔ ہم کو کوئی شخص مجبور نہیں کرتا کہ ہم بولیں لیکن اگر بولیں گے تو پھر بات کرنے والوں ہی کی طرح بات کرنی پڑے گی۔

میں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کو گذشتہ نمبر میں چھ دفعات کے اندر عرض کر چکا ہوں۔ مسئلے کے "خاتمے" کا یہ حال ہے کہ ان میں سے کسی ایک امر کے متعلق بھی آپ نے عذر نہیں کیا اور جتنا کچھ کیا، اس کا بھی یہی حال ہے کہ وہ گویائی پر خاموشی کی ترجیح و تقدم کی ایک مثال تازہ سے زیادہ نہیں!

اس بحث سے فارغ البال ہوکر آپ نے "خط" کو بمعنی مفرد منسر لذت فارسی سے ثابت کرنا چاہا ہے، حالانکہ پہلی بحث کی طرح یہ موضوع بھی

آپ کے بس کا نہ تھا اور آپ کے لئے اور نیز ہر اس شخص کے لئے جو آپ کی سی حالت رکھتا ہو، یہی بہتر ہے کہ وہ اِن امور میں دخل نہ دے جن سے ناواقف ہے۔

میں ہمیشہ اپنی معروضات میں بحث کے ان پہلوؤں سے نہایت احتراز کرتا ہوں، جن سے مخاطب کی واقفیت یا علم کے متعلق کوئی مخالف خیال پیدا ہوتا ہو کہ یہ طبائع کو رنجیدہ اور بحث کو مقصد سے دور کر دینے والی باتیں ہیں۔ اور اسی بنا پر "خط و کریب" کے بارے میں بھی میں نے باوجود ضرورت کے اس سے احتراز کیا، لیکن آپ کا لاحاصل اصرار بڑھتا جاتا ہے اور اس سے ضمناً زبان اور فارسی لغات کے متعلق نہایت سخت غلط فہمیاں اوروں کے لئے پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔ اس لئے اب مجبوراً عرض کرتا ہوں کہ آپ ان کاموں میں کیوں پڑتے ہیں جن کی نسبت نہ تو آپ کو علم ہے اور نہ واقفیت؟ میں نے "خط" کے متعلق غالب کا ایک شعر لکھ دیا تھا اور صرف اس لئے کہ اتفاقاً اس وقت یاد آ گیا۔ کوئی لفظ سند یا استدلال کا زبان نہ تھا۔ اس پر آپ متعجب ہو کر لکھتے ہیں:

"اور اس کے ثبوت میں غالب کا" ایک" شعر پیش کرنا آپ کافی سمجھتے ہیں جس میں خط کو حصے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے"

میں نے بطور سند کے تو نہیں لکھا تھا کیونکہ ایک ایسی بات لکھ رہا تھا جس سے آپ کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد ہر فارسی داں واقف ہے۔ لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کے اس "ایک" پر زور دینے کا مطلب بالکل سمجھ

میں نہیں آتا۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر دو چار سو شعروں کی ضرورت تھی؟ اگر غالب کا شعر پیش نہ کروں تو کیا ٹیک چند بہار، محمد حسین دکنی اور مولوی غیاث الدین رامپوری کی سند دوں؟

اس کے بعد آپ "واقعات" کو "دلائل" کے معنے میں استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ بہار عجم وغیرہ اس وقت سامنے موجود نہیں ورنہ غالباً "بقید صفحہ و سطر" میں بتا سکتا کہ فارسی کے متعدد لغت نویسوں نے خط کو لذت و مسرت کے معنی میں استعمال کرنے کی "افسوس ناک غلطی" کی ہے"

"عظیم الشان بہار عجم" کے نہ ملنے پر آپ کو جو افسوس ہے اس میں مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ مگر ساتھ ہی خود غرضانہ اسی کی خوشی بھی ہے کہ اگر خدانخواستہ دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کی یہ تیغ بے امان آپ کے ہاتھ آجاتی تو نہیں معلوم میری معروضات کی مسکین ہستی کا کیا حال ہوتا؟

پھر لطف یہ ہے کہ آپ "بقید صفحہ و سطر" بتلا دیتے، اور اس کے بعد غالباً قرنوں اور صدیوں تک کے لئے "خط بمعنی لذت" کا علم ثبوت سرزمین لغات فارسیہ و اصطلاحات علمیہ میں نصب ہوجاتا!! ذٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ۔

اس کے بعد دلائل و اسناد کی ایک عظیم الشان صف رونما ہوتی ہے جس کے سرخیل حلقہ حضرت "غیاث اللغات" ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے علامہ پامر مولانا وینکس، محقق اسٹین گاس، فارسی لغات کی موت و حیات کا

سررشتہ سنبھالتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں اور سب کے آخر میں خود جناب ہیں جو فن لغت کی اس مہیب تماشش کے بعد مجھے دعوت غور دفکر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

"غور فرمائیے کہ " اہل لغت " نہ صرف خط کو لذت کے معنے میں استعمال کرتے ہیں بلکہ اس سے جتنی تراکیب پیدا کرتے ہیں؟ ان سب میں بھی خط کے معنے لذت اور " صرف لذت " کے لیتے ہیں !"

جب آپ کی ہمہ دانی لغتیت کا یہ حال ہے تو ارباب علم انصاف کریں کہ اب میں کیا کہوں ؟ آپ کو کون سمجھائے کہ کسی فارسی لغت کا نولکشوری پریس میں چھپنا ہی دلیل وقار نہیں ہے ، اور نہ اس میں آپ کے حسب مطلب حظ کے لفظ کا مل جانا مستند ہونے کا کوئی ثبوت ۔ آپ غالب کے " ایک " شعر پر معترض ہیں جس نے (قاطع برہان) لکھ کر ہمیشہ کے لئے ہندوستانی لغت نویسوں کی آبرو مٹا دی ۔ مگر مسکین ٹیک چند کے نہ ملنے پر آپ کو افسوس ہے ، اور پورا یقین ہے کہ اگر (بہار عجم) کسی طرح میسر آجاتی تو "بقید صفحہ و سطر" بتلا کر آپ اس بحث کا خاتمہ کر دیتے ۔ حالانکہ جہاں (محمد حسین دکنی) کو کوئی نہیں پوچھتا ، وہاں (ٹیک چند) کا نام لینا ایک ایسی بات ہے جو صرف آپ ہی سے ممکن تھی ۔

"بہار عجم" کے نہ ملنے کے " افسوس " کے بعد " خوش قسمتی " سے غیاث اللغات آپ کی " میز " پر نکل آتی ہے ، چنانچہ آپ لکھتے ہیں ۔

"خوش قسمتی سے غیاث البتہ میز پر موجود ہے اور اس کی

عبارت یہ ہے ...."

افسوس ہے کہ آپ کی اس خوش قسمتی "میں بھی مجھ کو" بدقسمتی" سے خلل انداز ہونا پڑے گا۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ غیاث اللغات کا نام فارسی لغات کی بحث میں لینا نہایت تمسخر انگیز ہے۔ استدلال تو بجائے خود رہا، کوئی فارسی داں شخص اپنی میز پر اس کو جگہ دے کر آپ کی طرح خوش قسمت ہونا بھی پسند نہیں کرے گا۔

اس کے بعد آپ نے چند انگریزی لغات کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالے تمام پچھلے حوالوں سے بھی بڑھ کر افسوس ناک ہیں۔ آپ کو اردو سے تو اتنی ہمدردی ہے کہ عربی لغات کے ذکر پر متاسف ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ خود اردو بولنے والوں کو اردو لغات کی تحقیق کے لئے عربی لغات کی جانب رجوع کرنا پڑے"

رجوع تو کسی نے نہیں کیا تھا۔ لیکن بہر حال آپ کو اس پر افسوس ضرور ہے پھر خدارا مسکین فارسی پر بھی رحم کیجئے، جس کی لغات کے لئے باوجود ہزاروں دواوین و کلام شعراء فرس کے، آپ ہمیں (پامر) کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی کی دعوت دے رہے ہیں۔ محض اس حق کی بناء پر کہ "وہ کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں"!!

ان مباحث میں آپ کی معذوری واضح ہے، تاہم ایک غلطی تو آپ کا ادعائی اصرار ہے اور پھر دوسری غلطی ثبوت کے لئے لاحاصل کوشش کرنا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے اپنے طریق اثبات و استدلال

میں اس سے زیادہ افسوس ناک غلطی کی ہے، جو موضوع بحث میں آپ کر چکے ہیں۔

اغلاط استدلال

ایک شے ہے دعویٰ اور ایک چیز ہے استدلال۔ آپ نے دونوں میں غلطیاں کیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ خط بمعنی لذت اصطلاحاتِ علمیہ میں صحیح ہے۔ اور پھر دلائل پیش کرتے ہیں۔ ایک دعوے کی نسبت عرض کر چکا ہوں لیکن اس سے زیادہ غلطیاں آپ کے طریق استدلال نے پیدا کر دیں۔

(۱) آپ نے یہ غلط اصول قائم کر دیا کہ اردو کی عام بول چال اصطلاحات علمیہ میں مستند ہے۔

(۲) آپ نے ضمناً فرہنگ آصفیہ کو اردو لغات کی بحث میں قابلِ استناد قرار دیا، حالانکہ (مصنف فرہنگ معاف رکھیں) اسے یہ حیثیت حاصل نہیں۔

(۳) پھر اس غلط فہمی کا دروازہ کھول دیا کہ لغاتِ فارسی کی بحث میں غیاث اللغات کی سند معتبر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ بلا تکلف غیاث کا حوالہ دینا شروع کر دیں گے۔ اور پھر دوبارہ اس لغوی اڑچن کا اربابِ فن کو مقابلہ کرنا پڑے گا جو مرحوم غالب نے (قاطع برہان) لکھ کر اپنے سامنے آمادۂ پیکار پایا تھا

(۴) اس سے بھی بڑھ کر ظلم اکبر یہ کیا کہ فارسی لغات کی بحث میں انگریزی کی فارسی لغات کو مستند قرار دینے کی بدعت سیئہ کبیرہ کی بنیاد رکھی

جو فی الحقیقت ایک اشد شدید تمتہ نحویہ" ہے اور جو اگر چل نکلا تو اردو اور فارسی زبان کا بھی مذہب جو تفلاق کی طرح خدا حافظ!

پس مجھ کو جو اس تفصیلی تحریر کی ضرورت ہوئی تو صرف اصل بحث ہی کے متعلق ازالۂ اغلاط کا خیال محرک نہ تھا، بلکہ زیادہ تر یہ خیال کہ آپ کے طریق استدلال کے اغلاط نے اصل غلطی سے بڑھ کر چند غلطیاں اور پیدا کر دی ہیں اور وہ ایسی ہیں کہ اگر ان کو ظاہر نہ کیا جائے تو لغات و زبان کے متعلق ایک اصولی غلط فہمی میں لوگ گرفتار ہو جائیں گے۔ اگرچہ واقف کاروں کے لئے ان کی غلطیاں بالکل واضح و غیر محتاج انکشاف ہیں۔

پس ضرور ہے کہ اس حصہ بحث کے متعلق میں یہ ظاہر کر دوں کہ:

(۱) غیاث اللغات کوئی مستند لغت نہیں، اس کا حوالہ فارسی لغات کے مباحث میں بے کار ہے۔

(۲) اتنا ہی نہیں بلکہ بہار عجم وغیرہ لغات جو آج کل چھپ کر شائع ہو گئے ہیں، قطعاً غیر معتبر، تمسخر انگیز، اغلاط سے مملو، اور ناقابل استناد ہیں جن حضرات کی ان کتابوں پر نظر ہے اور جنھوں نے وہ مباحث دیکھے ہیں جو "برہان قاطع" کی اشاعت کے بعد تحریر میں آئے، نیز ان رسائل پر بھی نظر ڈالی ہے جو ان لغات کی حمایت میں مثل مؤید البرہان، ساطع برہان، تیغ تیز تر، قاطع قاطع، وغیرہ وغیرہ لکھے گئے، اور پھر قاطع برہان کے اس دوسرے ایڈیشن کو بھی دیکھا ہے جو درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوا تھا، ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں۔

(۳) یورپ کے بعض مستشرقین نے جو لغات لکھی ہیں ان کا حوالہ بہ حیثیت لغت کے بالکل غیر معتبر ہے۔ عام طور پر مستشرقین فرنگ کا یہ حال ہے کہ وہ مشرقی علوم و السنہ کے متعلق بعض اپنے مخصوص مباحثِ علمیہ میں نہایت مفید و نادر مطلب پیدا کر لیتے ہیں جن پر خود اس زبان کے بولنے والوں کو دسترس نہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ لغات و ادب کی بحث میں ان کی سند معتبر ہو۔

اکاذیب اور شرمناک

(بسلسلہ خط و کرب)

"۷ار ستمبر کے الہلال میں صفحہ ۲۲۱ سے لے کر صفحہ ۲۲۳ تک انشاء پردازی و خطابت کے پردے میں جن بہم "مغالطات" کا طومار یکجا کر دیا گیا ہے، ان کی داد "منطق" کے طلباء دیں گے میں اگر ان کی تردید دری" کرنا چاہوں بھی، تو شاید اپنے دوسرے مشاغل کو کافی صدمہ پہنچائے بغیر نہیں کر سکتا۔ البتہ اُن متعدد "بیباکانہ اکاذیب" میں سے، جو اس مضمون کی زیب و زینت کا باعث ہو رہے ہیں، ایک بات کا صاف کر دینا میں ہر حال میں ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ قطعاً غلط ہے، کہ میں اس معاملے میں "واقف کاروں" سے مشورہ طلب کر لینے، یا ان کے مشوروں کے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ میں خود بلا الہلال کے دربار سے کوئی ہدایت پاتے ہوئے، ملک کے ان متعدد تعلیم یافتہ حضرات سے مشورہ طلب کر چکا ہوں، جو میرے نزدیک

مشورہ دینے کے اہل، یا بہ قول آپ کے، "واقف کار" ہیں۔ میں نے اس مسئلہ میں مشورہ حاصل کیا ہے مسٹر سید کرامت حسین (سابق جج ہائی کورٹ) سے جو علوم عربیہ میں کمال رکھنے کے علاوہ فلسفۂ جدید (خصوصاً فلسفۂ اسپنسر) کے بھی عالم ہیں۔ میں نے استفادہ کیا ہے، مولانا حمید الدین بی اے (پروفیسر میور کالج الہ آباد) سے جن کی جامعیت علوم مغربیہ و مشرقیہ سے شاید آپ کو بھی انکار کی جرأت نہ ہو۔ میں نے استشارہ کیا ہے مولوی عبدالحق بی اے (صدر مہتمم تعلیمات حیدرآباد) سے، جو علاوہ علوم مغربی سے واقفیت کے عربی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ میں نے مشورہ حاصل کیا ہے، خان بہادر مبر اکبر حسین (الہ آبادی) سے، جو علاوہ اردو زبان میں سند ہونے کے فلسفۂ جدید کا خاصہ مذاق رکھتے ہیں۔ اور میں نے مشورہ طلب کیا ہے اپنے شہر کے پروفیسر مرزا محمد ہادی بی اے (کرسچن کالج) سے جو علوم قدیمہ و جدیدہ دونوں میں مشہور قابلیت رکھتے ہیں۔ حضرات موصوف کے علاوہ میں نے اور بھی ان متعدد تعلیم یافتہ لوگوں سے استصواب رائے کیا ہے، جن کی علمی و ادبی قابلیت کی شہرت ابھی غالباً اس فضا میں نہیں پہنچی ہے، جس میں الہلال کا نشو ونما ہو رہا ہے۔

اور پھر میں نے بعض ان سنجیدہ اصحاب سے بھی تبادلۂ خیالات میں کبھی تامل نہیں کیا، جو چند دنوں سے آپ کے اسٹاف میں ہیں۔ بعض حضرات سے ان مسائل پر کئی کئی گھنٹے گفتگو رہی ہے۔ میرے لائق دوست مولوی سید سلیمان نے جس محنت سے وضع اصطلاحات علمیہ پر ایک تحریر فرمائی ہے، نیز میرے ایک دوسرے دوست ("خدا بندہ" از جونپور) نے اسی مسئلہ لذت والم پر مضمون تحریر فرمایا تھا

میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

ہاں یہ جرم مجھ سے بلاشبہ سرزد ہوا ہے (اور شاید آپ کے ضابطۂ تعزیرات میں یہ جرم ناقابل معافی ہو) کہ میں نے اس شخص سے دستگیری کی التجا نہیں کی جس نے گو اپنی خطیبانہ سحر بیانیوں سے ایک بہت بڑی جماعت کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے مگر جس کے "خالص کمالات علمی" کا ثبوت مجھے اب تک باوجود سعی و تلاش کے نہیں مل سکا ہے۔

رہا آپ کا یہ دعویٰ کہ عربی میں فلسفہ کی بہتر سے بہتر اصطلاحات موجود ہیں بشرطیکہ تلاش کی جائیں، تو اس کے متعلق میں نے اپنے پچھلے خط میں جو سوال کیا تھا، وہ بدستور قائم ہے۔ مجھے تبلایئے کہ میں سایکالوجی، اپیسٹمالوجی، ایتھکس (اپنے جدید معنے میں) اور منطق استقرار کی مصطلحات کس کتب خانے میں تلاش کروں؟ کس کتاب میں ڈھونڈھوں؟ مصر کے نامور فضلا، مشہور مستشرقین یورپ اور خود ہندوستان کے مستند ترین فضلا (مثلاً شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی) تو اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن الہلال کو اپنے دعوے پر اصرار رہے، اور چونکہ یہ دعویٰ الہلال نے کیا ہے، اس لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں، محض اس کا اعادہ و تکرار کافی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ یہ خطیبانہ حربے، عوام فریب تقریروں و تحریروں میں خواہ کتنے ہی کارگر ہوتے ہوں، لیکن علمی مباحث میں ان کا استعمال قطعاً بے محل و غیر موثر ہونے کے ساتھ "بے حد شرمناک" ہے۔ سیاست اور مذہب مدت سے آپ کی تیغ خطابیات کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں، اب مہربانی کر کے علمی مسائل کی جان پر تو رحم فرمایئے۔"

(عبدالماجد دریا آبادی)

سخت شرمائے وہ، اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا!

اب تک تو صرف حظ و کرب کے متعلق بحث تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی لغات و مصطلحات جدیدہ و مخترعہ میں اور چند الفاظ و اصطلاحات کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر وضع و اختراع کی رفتار ایسی ہی تیز رہی تو مجھے ہمت ہار دینے کا علانیہ اعتراف ہے:۔

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

اب تک تو صرف یہی مصیبت تھی کہ آپ "حظ و کرب" کا مطلب وہ نہیں سمجھتے جو سمجھنا چاہیئے، لیکن یہ تو بڑی مصیبت ہو گئی کہ اب مغالطات، منطق، پردہ دری، بے باکانہ اکاذیب، کمالات علمیہ، اور بے حد شرمناک کے متعلق بھی مجھے خوف پیدا ہو گیا ہے کہ آپ ان کے معانی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ان الفاظ کو کن موقعوں پر بولنا چاہیئے؟ میں نے اسی لئے آپ کی تحریر میں اس طرح کے الفاظ کو ان ورند کاماسے ممتاز کر دیا ہے۔

اگر میں چاہوں تو بغیر اپنے مشاغل کو صدمہ پہنچائے " ان الفاظ کے معانی بھی عرض کر سکتا ہوں، جو افسوس ہے کہ مثل "حظ و کرب" کے آپ کو معلوم نہیں لیکن چونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ غصہ میں آ گئے ہیں، اور آدمی غصہ میں اکثر گالیوں پر اتر ہی آتا ہے۔ اس لئے آپ کو معذور سمجھتا ہوں اور آپ کے غصہ پر ہنستا ہوں کاش آپ کو یاد رہا ہوتا کہ مسائل علمیہ کا فیصلہ گالیوں اور محض ادعائی الزام سے نہیں ہوتا۔ (اکاذیب) اور (شرمناک) کے استعمال کے لئے محض ان دو لفظوں کو

مثل حظ و کرب کے سن لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مواقع استعمال کو بھی مثل "حظ و کرب" کے معلوم کرنا چاہیئے۔

غصے میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اٹھائے عتاب میں

اب آپ اور بگڑیں گے اور کہیں گے کہ مسائل علمیہ میں ایسے عاشقانہ شعروں کا پڑھنا "اکاذیب" ہے "بہتان" ہے "بے حد شرمناک" ہے۔ لیکن خیر، بحد شرمناک اقدامات تو پہلے ہی کر چکا ہوں، اب کیا ہے کہ دو گھڑی کے لئے آپ کے عشوہ طرازانہ غیظ و غضب سے جی بھی نہ بہلاؤں ؎

گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق
جو تیری خو تھی، وہ ہی مرا مدعا ہوا

البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو تحریر و تالیف کا شوق ہے، آپ علمی مباحث میں مشغول رہنا چاہتے ہیں، بہتر ہے کہ طبیعت میں صبر و سکون پیدا کیجئے اور نکتہ چینی سے گھبرا نہ اٹھئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلاح و مذہب کے کاموں میں جس قدر سختی ضروری اور بعض حالتوں میں سخت سے سخت الفاظ کا استعمال تک بھی عین عدل و انصاف ہے، اتنا ہی علمی مباحث میں اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اپنی رائے پر نہایت سختی سے قائم رہیئے، مخالف کا سخت سے سخت پیرایۂ نقد میں جواب دیجئے، مگر دشنام آمیز الفاظ کا استعمال اور غلط الزام دہی کسی طرح جائز نہیں۔ نہ ذرا سی بات پر بگڑ اٹھنا، اور مخاطب پر بغیر کسی ثبوت کے کذب و افترا اور اعمال سخریہ کا الزام لگانا، لوگوں کی نظر میں آپ کے وقار کو کھو دے گا، اور جن کاموں میں آپ رہنا

چاہتے ہیں ان کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اس طرح کی طفلانہ بحث آپ کی اس حیثیت کو صدمہ پہنچائے گی، جس کے آپ خواہش مند ہیں، یعنی علمی زندگی کے اختیار کرنے میں مارج ہوگی۔ اور پھر ویسے بھی آپ جانتے ہیں کہ کسی راہ چلتے بھلے آدمی کو گالی دے دینا اس خیال سے، کہ شریف آدمی ہے مارے گا نہیں، کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اگر میں آپ سے پوچھ بیٹھوں کہ " اکاذیب' بہتان، بعید شرمناک اور مغالطات میری تحریرات میں سے نکالئے تو آپ کے لئے کیسی مشکل ہو؟

" بہتان" اور" شرمناک" کا یہ حال ہے کہ میں نے چند سطروں میں آپ کو ابتداً توجہ دلائی اور مجبوراً، کیونکہ مضمون کے عنوان میں تبدیلی نہیں کرسکتا تھا۔ آپ نے اپنے وجوہ لکھے، میں نے اس کے متعلق پھر چند سطریں لکھیں۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ ابر غور کرتے اور سمجھ کر کچھ کہتے، لیکن آپ نے فرہنگ آصفیہ، غیاث اللغات، بامر، وبکینس، اور اسٹین گاس کی سندات کا پشتارا اٹھایا اور بلا تامل پٹک دیا۔ اس پر میں نے دیکھا کہ اصل موضوع کے علاوہ چند در چند غلطیاں ایسی پیدا ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے زبان اور وضع اصطلاحات و استناد و استشہاد کتب کی نسبت لوگوں کو سخت غلط فہمیاں ہوں گی اور ایک فتنۂ لغویہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ میں نے تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے۔ تاہم بحث سے پہلے آپ کے شوق علمی کی تعریف کی۔ آپ کو عام تعلیم یافتہ طبقہ کی جہل سالہ خیرہ ذوقی سے الگ پاتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ اس کا اظہار کیا، اور پورے مضمون میں کہیں بھی کوئی سخت لفظ یا" شرمناک" الزام آپ پر نہ لگایا کہ ایسے مباحث میں ان باتوں کا

موقع ہی کیا تھا۔

میں نے اول سے آخر تک اصولاً بحث کی اور پھر آخر میں دفعہ وار نتائج بحث پیش کر دیئے ان تمام دفعات میں سے ایک دفعہ کی نسبت بھی آپ نے کچھ نہیں لکھا اور نہ کوئی جواب دیا۔ آپ" کو اپنے اشغال" کے معزوب و مجروح ہونے کا خوف ہے، لیکن افسوس کہ آپ کو ایک کالم سے زیادہ لاحاصل دشنام دہی اور ادعائی الزام کی فرصت مل گئی، مگر میرے سوالوں کا جواب دینے کا موقع نہ ملا؟ میں نے استعمال اصطلاحات عام بول چال اور اصطلاحات علمیہ کے اختلاف، الفاظ ہندی و دخیلہ کی حقیقت، غیاث اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے حوالے، انگریزی لغات سے استشہاد اور متعدد امور کی نسبت جو کچھ لکھا، اس کا کیا علاج ہے کہ آپ کو اس میں صرف" اتہام" "بیحد شرمناک" "مغالطات" اور "اکاذیب" ہی نظر آیا؟ اور اس پر ستم جانکاہ یہ کہ اپنے اشغال عظیمہ اور اعمال علمیہ کو ٹھیس لگنے کے خوف سے ثبوت و دلیل کی فرصت بھی نہیں!

کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

"انشاپردازی" اور "خطابت" جس سے کام لینے کی آپ نے اس تحریر میں نہایت غیر مخفی سعی کی ہے، بار بار آپ کی زبان پر آتا ہے۔ خطابت فن تقریر کو کہتے ہیں۔ غالباً خطابت کو آپ خطابیات کے معنوں میں بول گئے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے لئے بھی آپ کو صبر و انتظار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر آپ یا آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اس نادانی میں مبتلا ہوں کہ مباحث علمیہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کا طرز تحریر قصداً نہایت روکھا پھیکا، اور غیر انشاپردازانہ رکھا جائے۔

اگر ایسا نہیں ہے تو وہ کوئی علمی بحث بھی نہیں، تو یہ نہایت سخت غلطی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ علمی مباحث کو عام ادبیات سے مختلف ہونا چاہیئے، لیکن اس اختلاف کی بنا طرز تحریر نہیں بلکہ مطالب کا اختلاف ہے۔

یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن حظ و کرب کے متعلق میری تحریر کوئی علم و فن کا مقابلہ نہ تھا بلکہ آپ کے مضمون پر ایک سرسری نقد تھا۔ اگر انشا پردازی سے آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی عبارت اچھی اور اس کے الفاظ اور جملے بلیغانہ تھے تو کوئی شخص آپ کی اس تعریض کا مطلب نہ سمجھ سکے گا کہ کسی مضمون کا خوش عبارت و بلیغ الفاظ ہونا اس کے پیش کردہ مطالب کے غلط ہونے کے لئے کیونکر مستلزم ہے؟ اگر ایک شخص اپنے ہر طرح کے مطالب کو اچھی عبارت میں لکھ سکتا ہے تو یہ اللہ کا ایک فضل ہے اور یقیناً خوشی کی بات ہے۔ پھر آپ اس کے لئے غمگین کیوں ہیں؟ کیا آپ کے جواب دینے کے لئے یہ بھی ایک شرط ہے کہ مضمون "غیر انشا پردازانہ ہو؟"

آپ نے تمام مضمون میں صرف ایک ہی بات موضوع بحث کے متعلق لکھی ہے یعنی یہ کہ آپ نے اس بارے میں ارباب علم سے مشورہ کیا ہے۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں بتلایا کہ کس بارے میں مشورہ کیا ہے؟ لذت و الم کے غیر کافی ہونے میں یا حظ و کرب کی صحت میں؟ تاہم اگر یہ سچ ہے کہ ان حضرات نے حظ و کرب کو صحیح بتلایا ہے تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ ان سب نے غلطی کی ہے، جس طرح میں خود بھی اپنے خیال میں غلطی پر ہو سکتا ہوں۔ آپ کم از کم اس امر کو صاف کر دیں کہ آپ کا یہ استفتا کس سوال پر مشتمل تھا، تاکہ اس سے جواب کا تعلق و مفہوم متعین ہو سکے۔

آپ نے بے فائدہ یہ لکھ کر اپنی طبیعت کو خوش کرنا چاہا کہ میرے علمی کمالات کا کوئی ثبوت نہیں۔ بھائی معلوم نہیں کہ علم سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ کہیں حظ و کرب اور اتہام و شرمناک کی طرح اس بار ے میں بھی کوئی اختراع خاص نہ ہو۔ کیونکہ اب آپ کے ہر لفظ کے متعلق شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خیر، کچھ بھی مقصود ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنے ترکش طنز و تشنیع کا سب سے زیادہ قیمتی تیر ایک ایسے نشانے کی فکر میں ضائع کیا، جہاں اس کے صرف کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ میں نے آج تک کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ علم و فن کا میں ماہر ہوں البتہ ان لوگوں کو شرمانا چاہیئے جو آج چالیس سال سے علمی توقعات کا مرکز ہیں، جنھوں نے یورپ کی علمی زبان کی تحصیل کی ہے، اور جو فی الحقیقت خدمت علم انجام دینے کے لئے تمام ملک میں صرف ایک ہی گروہ ہے۔ وہ اگر اپنے علمی کمالات کا ثبوت دینے میں مقصر رہے ہیں تو ان کے لئے افسوسناک ہے، نہ کہ میرے لئے۔

آپ نے اپنے "تلاش" کا بھی لفظ لکھا ہے کہ باوجود سعی و تلاش علمی کمالات کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ لیکن یہ تلاش ویسی ہی تلاش تو نہ تھی جیسی آپ نے "حظ" کی تحقیق و جستجو میں حضرت غیاث اللغات اور علامہ پامر کی رہنمائی میں کی تھی؟ اگر ایسا ہے تو پھر صورت حال دوسری ہی ہو جاتی ہے۔

آخر میں آپ سے پھر کہوں گا کہ محض دوسرے کو ادعائی الزام دے دینے، غصہ میں آ کر روٹھ جانے، مخاطب کو جاہل کہہ دینے اور گالیوں کے دینے سے کسی بحث کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ آپ لکھنے پڑھنے کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اپنی طبیعت کو بدلئے۔ اس مضمون کو آپ نے غیظ و غضب کے عالم میں لکھا ہی

اس لئے قابل معافی ہے۔ لیکن ایک علمی مذاق رکھنے والے شخص کو اس درجہ غصہ زیب نہیں دیتا۔ آپ نے میری تحریر کے متعلق نہایت افسوسناک طریقہ سے بلا قصد غلط بیانیاں کی ہیں۔ اگر میں چاہوں تو زیادہ سخت الفاظ لغت میں مل سکتے ہیں، لیکن پھر اس سے کیا حاصل؟ بحث و مباحثہ سے مقصود کسی لفظ کی تحقیق وسعت و صحت کا کشف ہے نہ کہ اور کچھ۔ میں نے اپنی تمام تحریر میں کوئی لفظ سخت نہیں لکھا اور بہتر تھا کہ آپ اس کا جواب دیتے۔ جواب کی جگہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ میرے لئے بہت مایوسی پیدا کرتا ہے۔ تاہم میں ہنستا ہوں، اور ایسی نادانیوں کو ہنس کر ٹال دینا ہی بہتر ہے۔

میں بہت خوش ہوں کہ گو آپ نے اپنا مضمون بازار کے کسی چبوترے پر سے شروع کیا، لیکن خاتمہ ناصحانہ انداز میں ہوا ہے۔ آپ نے محبت علم و عشق فن سے بیقرار ہو کر نصیحت کی ہے کہ "مذہب اور سیاست تو تیغ خطابات سے زخمی ہو چکے ہیں اب علم پر رحم کیجئے۔"

اللہ اللہ آپ کو بھی مذہب کے زخمی ہونے کا درد ہے!

اینکہ می بینم، بہ بیداریست یارب یا بخواب؟

یہ ایک نہایت مسرت انگیز خبر ہے۔ تاہم مذہب و سیاست کی تو آپ چنداں فکر کریں نہیں۔ اس کی تو آپ حضرات کی خدمات حیات افزا سے تلافی ہو ہی گئی ہے اور ہو رہے گی۔ رہا علم، تو اللہ اس کے زخموں کو آپ کے دست مسیحائی سے مرہم پٹی مبارک کرے۔ البتہ اس تقسیم سے "غریب زبان" رہ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں "خوش قسمتی" سے فرہنگ آصفیہ اور غیاث اللغات آپ کی "میز" پر موجود ہی ہیں۔ خدا اس "خوش قسمتی" سے ہمیشہ علم و ملت کو بہرہ ور اور شادکام فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

حیران ہوں کہ "مذہب و سیاست" کا لفظ کس آسانی سے آپ لوگ بول اٹھتے ہیں!

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

مرزا غالب مرحوم

کا

غیر مطبوعہ کلام

مصائب غدر۔ قلعۂ معلی کی تباہی۔ وفاداری و بغاوت کی ایک قدیم حکایت!

مرزا غالب مرحوم کا سال وفات "آہ غالب بمرد" ہے یعنی ۱۲۸۵ھ۔

اس لحاظ سے فی الحقیقت ان کا شمار موجودہ عصر جدید کے عہد میں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں پریس سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں رائج ہو چکا تھا اور غدر سے پہلے خود دہلی میں حاجی قطب الدین وغیرہ تجار کتب نے بعض پریس قائم کر دئے تھے۔ پس ان کو اپنی تصنیف و تالیف کے لئے ابتدا ہی سے پریس موجود ملا، اور اپنے حاصل عمر کو اشاعت و طباعت کے لئے غیروں پر چھوڑ کر دنیا سے چلے جانے کی

مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑا، جو فی الحقیقت کسی صاحب کمال کے لئے زمانہ گزشتہ کی سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جانکاہ صدمہ رہا ہے

ان کی کلیات نظم و نثر اور مکاتیب و رسائل اردو فارسی کی تمام کتابیں باستثنائے اردوئے معلیٰ دیوان کے انتقال کے بعد مرتب ہوئی ان کی زندگی میں خود انھیں کی زیر نگرانی شائع ہو چکی تھیں۔ دیوان فارسی غالباً سب سے پہلے مطبع اودھ اخبار لکھنؤ (نولکشور پریس) میں خود چھپوایا۔ اسی طرح پہلے مہر نیمروز، پھر مع دستنبو و مکاتیب فارسیہ باسم پنج آہنگ شائع کی۔ قاطع برہان، درفش کاویانی، نامۂ غالب، تیغ تیز وغیرہ دہلی میں چھپوائیں۔ دیوان اردو بھی غالباً پہلے مطبع اودھ اخبار میں اور پھر مکرر سہ کرر دہلی و لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں جس قدر اردو کلام کہا گیا، وہ نئے اڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا۔ جو پہلا اڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپا تھا، اسی کی نقلیں چھپتی رہیں بہ خلاف کلیات نظم فارسی کے جس کا پہلا اڈیشن اور موجودہ اڈیشن، دونوں میرے پاس موجود ہیں مگر دونوں کے قصائد و غزلیات و قطعات وغیرہ کی تعداد میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ملکہ وکٹوریا کی مدح کا قصیدہ:

دور روزگار ہا نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

اور ۳۳ وال قصیدہ سر اکلینڈ کالون والا:

بہرکس شیوۂ خاصی در ایثار ست او زانی
زمن مدح وزیر لارڈ ایلن برا گنجینہ افشانی

اور لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ اور عطائے خطابات کی تبریک:-

زسال نو دگر ابے بردۓ کار آمد

وغیرہ قصائد ہیں۔ اسی طرح سر سالار جنگ اعظم کی مدح کا مشہور قصیدہ:

شرطست کہ داستاں نہ گویم

بھی نہیں ہے کہ یہ غدر کے بعد لکھا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلیات نظم کے ہر ایڈیشن میں نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا۔

مگر افسوس کہ اردو دیوان کی قسمت اس بارے میں نارسا رہی اور نیا کلام اس میں شامل ہوتا نہ رہا۔ اس کا ثبوت وہ متعدد غزلیں قطعات، رباعیاں، اور بعض اردو قصائد ہیں جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہیں اور مطبوعہ دیوان میں ان کا پتہ نہیں۔

اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے دو اردو رباعیاں میں نے اُس مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر خود میرزا صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دیکھی ہیں جو انھوں نے خواجہ فخرالدین حسین دہلوی مصنف سروش سخن کو دیا تھا۔ اور دو قصیدے، دو قطعے، ایک قطعہ تاریخ، تین غزلیں دیوان اردو کے اُس قلمی نسخے میں ہیں جو نواب سعیدالدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی کے پاس موجود ہے۔ اس مرتبہ دہلی میں وہ نسخہ چند دنوں تک

میرے پاس رہا اور میں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ اس کے لئے میں نواب صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔

ان نظموں میں اردو کا ایک مختصر قصیدہ ہے جسے آج بہ سلسلۂ ادبیات(۱) شائع کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل نئی چیز ہے اور علاوہ غیر مطبوعہ ہونے کے اس سے مرزا مرحوم کے حالات و سوانح پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔

قصیدہ

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی سرکاری دربار ۱۳ جنوری کو منعقد ہوا تھا جس میں حسب معمول مرزا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا لیکن جب وہاں پہنچے تو ان کی عزت قدیمہ کے مطابق نشست و ترتیب کا کوئی انتظام نہ تھا حتیٰ کہ انھیں نہایت ہی ادنیٰ صف میں کرسی ملی۔ یہ دیکھ کر سخت متاسف ہوئے کہ قدیمی باتیں خواب و خیال ہو گئی ہیں:۔

اُس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

"از روئے اہتمام" یعنی از روئے قاعدہ و ترتیب دربار جس میں یہ بہت پیچھے اور عام صفوں میں بٹھائے گئے ہوں گے۔

اس حالت کو دوسروں نے بھی محسوس کیا اور اشارے ہونے

(۱) یہ قصیدہ صفحہ ۱۸۰ پر ملاحظہ فرمائیے

دربار میں جو مچ یہ چلی چشمک عوام!

دربار کے بعد انھوں نے چاہا کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ملیں اور عرض حال کریں لیکن ریل کا وقت کم رہ گیا تھا اور دربار کا ہجوم بھی بہت تھا، ملاقات کا موقع نہ ملا:

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدہام
اس کشمکش میں "آپ کا" مداح نامور
"آقائے نامور" سے نہ کچھ کر سکا کلام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار دہلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ ہوا ہوگا کیونکہ ریل کے وقت کا ذکر کرتے ہیں "آپ کا مداح نامور" میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سے خطاب ہے۔ معلوم نہیں "آقائے نامور" سے بھی خود وہی مراد ہیں یا کوئی اور، تخاطب کے بعد اس طرح کے ضمیر نما وصف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا۔

اس زمانے میں لدھیانہ سے کوئی اخبار نکلتا تھا اس نے دربار کی روئداد چھاپتے ہوئے یہ تمام باتیں لکھ دیں۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ ان کا نام اور لقب لکھنے میں کچھ ایسی غلطیاں کر دیں جسے دیکھ کر ان کا رنج اور دوگنا ہوگیا:

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے کلیجا لیا ہے تھام!

معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں انھیں معمولی خلعت بھی نہیں دیا گیا اور نہ نذر دینے والوں میں شمار کیے گئے:

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

لیکن قصیدے سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ کس زمانے کا یہ واقعہ ہے اور کس دربار کا ذکر کر رہے ہیں؟ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد کا دربار ہے۔ کیونکہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح کی ہے نیز اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔

میں نے اس وقت مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہی مگر کتابوں میں ملی نہیں۔ غالباً اس واقعہ کے متعلق اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید یہ قصیدہ غدر کے بعد کے اس سالہ عہد سے تعلق رکھتا ہے، جبکہ قیام دہلی، تعلق قلعہ، اور فتح کے بعد عدم حاضری کی وجہ سے ان کا سرکاری وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ ان کی وفاداری مشتبہ سمجھی گئی تھی اور بڑی ہی تکلیف و شدائد کی زندگی بسر کرتے تھے

مصائب غدر اور مرزا غالب

غدر میں مرزا گھر سے باہر نہیں نکلے اور آخر تک بند رہے۔ مہاراجہ ٹپیالہ کی سرکار سے سپاہی متعین ہو گئے تھے جو غفران مآب حکیم محمود خاں مرحوم اور مرزا غالب، دونوں کے مکانوں کی حفاظت کرتے تھے[1]۔

غدر کی تمام بربادیاں اور اس قلعۂ دہلی کی تمام خونریزیاں ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے گزریں جو ہندوستان میں ششش صد سالہ حکومت اسلامی کا آخری نقش قدم تھا، اور گو بہادر شاہ (رح) خود کچھ نہ تھا لیکن اس کے بقاے عظمت و جبروت اسلامی کی ایک بہت بڑی روح زندہ تھی۔ اُس کے مٹنے سے اکبر و شاہجہاں کا گھر بے چراغ ہو گیا! اس کا مٹنا درحقیقت سلالۂ تیمور و آل بابر کا مٹنا تھا۔ معتصم عباسی خود کچھ نہ تھا لیکن جب فتنۂ تاتار میں بغداد کے محل لوٹے گئے تو معتصم کی جگہ ہارون و مامون کی عظمت لٹ رہی تھی!

---

(۱) بلیماروں میں حکیم صاحب کے مکان کے سامنے مسجد ہے۔ بالکل اس سے متصل مرزا مرحوم کا کوٹھا تھا، جہاں غدر سے بیشتر آ رہے تھے۔ آج کل ہندوستانی دواخانہ جس مکان میں ہے ٹھیک اس کے مقابل مرزا صاحب رہتے تھے میں جب کبھی وہاں سے گزرتا ہوں تو شوق و عقیدت کی ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ اسی مسجد کے قرب کی نسبت کہا تھا:

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے ۔ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے!

وما کان قیسٌ ھلکہ ھلکُ واحدٍ
ولکنہ بنیان قومٍ تھدما!

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مداحی کی تھی، اور وہ قصیدے جو عرفی اور نظیری کے قصائد سے مقابلے کا دم رکھتے تھے اور ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کیے تھے جس کے سر جہانگیر و شاہجہاں کا تاج تو ضرور تھا، پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زرِ خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ۔ تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا، اس کا مخاطب خود بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا بلکہ اُس تختِ اعظم کی روحِ صولت و عظمت اس کے سامنے ہوتی تھی جس پر کبھی بیٹھ کر اکبر نے فیضی سے، جہانگیر نے عرفی و طالب سے اور شاہجہاں نے کلیم سے مدحیہ قصائد سنے تھے، اور جو اب بھی جشنِ نوروز و عید کے دن اُس زرد زرد دھوپ کی طرح جو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے، دیوانِ عام و خاص کے طلائی ستونوں کے نیچے چند لمحوں کے لئے نظر آجاتی تھی!

کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقیست!

چنانچہ اُن کے اکثر قصائد مدحیہ کی تشبیبوں میں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو مہر نیمروز کے دیباچہ میں حضرت بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرکے لکھی ہے۔ اس سوزِ درونی اور اُس آتشِ نہانی

کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے، جس کا شعلہ کاروانِ عظمت کے اِس آخری مسافر کو دیکھ کر بے اختیار ان کے دل میں بھڑک اٹھتا تھا۔ اور جس کو وقت کی نزاکت اور انگریزی حکومت کے ذریعہ وظیفہ حاصل کرنے کے تعلق، نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ طماعی و وارستگی نے غالب آکر بظاہر پوشیدہ و افسردہ کر دیا تھا!

فتح دہلی کے بعد جو عالمگیر اور عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پر نازل ہوئی، اور جس طرح شاہجہاں آباد کی ان سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبقرانِ اعظم کی سواری کے لئے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظرِ خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اُن چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دارالخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں:

فلا تسئلن عما جرٰی یوم حصرھم
وذلك مما لیس یدخل فی حصر؛

علی الخصوص قلعۂ معلّی کی بربادیاں جن کے لئے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، اور جن کے غم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجسادِ محترمہ و رفیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم و صاحبقرانِ ثانی کی خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے، جنھوں نے چھ صدیوں

سے متصل شہنشاہی اور فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی جنھیں حکم و سلطنت کے عیش و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہ ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ اُن کروڑں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے، کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اُس عظمت رفتہ کا افسانۂ ماتم سنائیں، جو چند روز پیشتر تک دنیا میں صرف اُنھی کے لئے تھی؟

غدا سمرًا بین الانام حدیثهم　　وذا سمرٍ یدمی المسامع کالسمر!
تحیة مشتاق والف ترحم　　علی الشهداء الطاهرین من الوزر!

ان الملوك اذا دخلوا قریة، افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة و کذلك تفعلون (۲۷: ۳۴)

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لئے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے اور دیکھتے رہے تھے۔ یہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں!

گو ضرورت و احتیاج نے انھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا اور مدحیہ قصائد لکھوائے تھے، تاہم "مرزا

صاحب شفیق و مہربان" کے خطابات اور ساٹھ ستر روپیہ کا خلعت اُس زخم کاری کا مرہم تو نہیں ہو سکتا تھا جو حادث غدر سے ان کے دل پر لگا ہوگا؟ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت و احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپرے دل سے کر بیٹھتا ہے مگر پھر اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبت عظمیٰ کے موقع پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار و ملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی!

الزام بغاوت

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کا جو اثر ایک مسلمان ہندوستانی کے قلب پر پڑتا تھا، مرزا مرحوم پر بھی پڑا اور اُن کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے جا کر خوشامد و عاجزی کریں، اور اُس عیش و نشاط تازہ کا تماشہ دیکھیں جو دہلی مرحوم کی بربادی و تباہی کے غم و ماتم سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ خود ہی کہہ چکے تھے:

ہر جادہ کہ از نقش پئے تست بہ گلشن

جاکیست بہ جیب ہوس انداختۂ ما!

ان کے تعلقات حکام انگریزی کے ساتھ ابتدا سے خوشامدانہ رہے تھے۔ ان کا وظیفہ اُنہی کے ہاتھ تھا۔ اس کمبخت وظیفہ کے واگذار کرنے کے لئے اُنھیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح و ثنا میں

اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے! پھر وقت بھی ایسا پر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا، اور سولی کے تختوں اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ بڑی ہی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے۔ تاہم ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے، انعامات و سندات ملیں، اُن تمام لوگوں نے بڑی بڑی کوششیں کر کے اپنے تئیں نمایاں کیا جنھوں نے غدر میں حصہ نہیں لیا تھا اور اس کے صلہ و اکرام سے مالا مال ہوئے، مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جا کر اس کا منتقم و قاہر چہرہ نہ دیکھا!

بعد کو اپنی بریت کے لئے انھوں نے اس عدم حاضری کے بہت سے وجوہ بیان کئے تھے، مگر اصل حقیقت یہی تھی کہ دل دردمند کے ہاتھوں پا در بند ہو گئے اور مصلحت و ضرورت کی عاقبت اندیشیوں کی کچھ نہ چلی، بعد کو ہوش آیا تو عذر بنا کر پیش کرنے پڑے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری حلقوں میں عام طور پر اس ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کی نسبت ٹھیک اسی طرح "غیر وفاداری" کا یقین ہو گیا، جس طرح آج کل بہت سے نثر نویسوں کی نسبت یقین کیا جاتا ہے جو اپنے دلی جذبات و حسیات کے ہاتھوں مجبور ہیں، اُن کی

وہ پنشن بھی بند ہوگئی جو اُن کی زندگی کا اصلی آذوقہ تھی اور چند جام ہائے "فرنچ" گلاب آمیز(۱) کا وسیلہ تھی۔ انگریزی درباروں میں پرسش و طلب اور عام تعلقات لطف و نوازش بھی یک قلم موقوف ہوگئے اور پوری طرح نیم باغیوں میں شمار ہونے لگا!

مرزا مرحوم کے لئے یہ حالت بڑی ہی سخت مصیبت تھی۔ ایک شاعرانہ کڑی منزلوں کا مرد نہیں ہوسکتا۔ انوری نے صاف کہدیا ہے:

حکیم و شاعر و ملا چگونہ جنگ کنند؟

قلعہ کے برباد ہونے سے وہ چند روپئے بھی جاتے رہے جو بہ تعلق تاریخ نویسی و شاعری ملا کرتے تھے۔ اس پر سرکاری وظیفہ کا بند ہوجانا قیامت تھا۔ شام کی سرشاری اور صبوحی کی خمار شکنی دونوں سے محروم ہوگئے۔ ساری زندگی آزادانہ داد دستد

---

(۱) مرزا مرحوم اپنے فارسی خطوں میں ولایتی شراب کو "فرنچ" لکھا کرتے ہیں۔ فرانس اور اسپین شراب سازی کا مرکز ہیں۔ کوئی فرانسیسی شراب لی ہوگی جس کو ساختۂ فرانس ہونے کی وجہ سے "فرنچ" کہدیا ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے عالم وارستگی میں یہی نام رکھ لیا۔ قاعدہ تھا کہ اس کی تیزی کم کرنے کے لئے گاہ گاہ عرق گلاب ملا لیا کرتے تھے چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست　　آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را!

اور یک گونہ فارغ البالی میں بسر ہوئی تھی اب فاقہ مستی تک نوبت پہنچ گئی اور صرف دوستوں اور شاگردوں کی خدمت گزاری پر دن کٹنے لگے۔ اس زمانے کے خطوط اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے تنگ آگئے تھے اور سرکاری وظیفہ کی واگزاری اور الزام بغاوت سے بریت کے لئے بڑی کوششیں کرتے تھے۔

غیر مطبوعہ قصیدہ

یہ زمانہ تین سال تک رہا اور صفائی کی کوئی کوشش سودمند نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دربار خلعت کا نہ ملنا، نذر وغیرہ کا سلسلہ بند ہوجانا قدیمی عزت و احترام کی یاد اپنی بے آبروئی و بے عزتی پر حسرت و افسوس، یہ تمام باتیں جو اس میں پائی جاتی ہیں، صرف اسی زمانے کی شکایتیں ہوسکتی ہیں۔ غالباً لارڈ کیننگ نے جنوری ۱۸۶۰ء میں جو دربار آگرہ میں لب دریائے جمنا کیا تھا، اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دہلی سے اس میں شریک ہونے کے لئے شاید آگرہ گئے ہوں گے "لب دریا" خیموں کے لگنے اور ریل کا وقت کم ہونے کے ذکر سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تصدیق ان کے بعض فارسی قصائد وقطعات سے بھی ہوتی ہے جو اسی زمانے میں لکھے گئے تھے، اور جو بالکل اس اردو

قصیدے کے ہم معنی و ہم مطلب ہیں۔

مثلاً غدر کے بعد جو فارسی قطعہ مسٹر اڈمنسٹن بہادر لفٹننٹ گورنر صوبۂ شمال و مغربی کو مخاطب کر کے لکھا ہے، اور جس کا پہلا شعر:

فرزانۂ یگانہ ، اڈمنسٹن بہادر
کاموخت دانش از وے آئین کاردانی

ہے۔ اس میں اپنی مصیبتوں کا افسانہ سنا کر الزام شرکت بغاوت سے اپنی بریت کی ہے اور کہا ہے کہ حکام کے دل میری جانب سے پھر گئے ہیں۔ آپ مدد کیجئے اور میری صفائی کرا دیجئے!

چنانچہ کہتے ہیں کہ میرے تعلقات انگریزی حکومت سے نہایت قدیمی ہیں۔ میں ہمیشہ حکام کی مدح میں قصائد لکھتا رہا اور صلہ و انعام سے شادکام ہوا:

از حضرت شہنشہ خاطر نشان من بود
در مزد مدح سنجی صد گونہ کامرانی

یہی حالت تھی کہ:

ناگہ تند بادی کاں خاست در قلمرو
برہم زد آں بنا را نیرنگ آسمانی!

یعنی غدر کا ظہور ہوا۔

در وقت فتنہ بودم غمگین دبود بامن
زاری و بے نوائی، پیری و ناتوانی!

حاشا کہ بودہ باشم "باغی" آشکارا
حاشا کہ کردہ باشم ترک وفا نہانی!
از تہمتے کہ برمن بستند بدسگالاں
حکام راست بامن یک گونہ سرگرانی

یعنی غدر کے زمانے میں پیری و ناتوانی کی وجہ سے کہیں آ جا نہ سکا اور اظہار وفاداری نہ کر سکا۔ باغیوں سے مجھے کوئی تعلق ظاہر و باطن نہ تھا محض تہمت تراشی سے مقامی حکام مجھ سے بدظن ہو گئے ہیں۔

اسی طرح ۱۸۶۰ء میں جب لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے دربار کیا ہے تو دو مطلعوں کا ایک پر زور قصیدہ لکھ کر پیش کیا:

زسال نو دگر آبے بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد

اس قصیدے کے آخر میں وہ سب شکایتیں ایک ایک کر کے لکھی ہیں جن کے لئے اس غیر مطبوعہ اُردو قصیدے میں لفٹننٹ گورنر پنجاب سے فریادی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ایک ہی وقت کی لکھی ہوئی دونوں چیزیں ہیں۔ فارسی قصیدہ وائسرائے کے پاس بھیجا ہوگا، اور یہ اردو کا غیر مطبوعہ قصیدہ لفٹننٹ گورنر پنجاب کے پاس اُردو قصیدے میں نمبر کرسی، خلعت و نذر، وظیفہ و انعام، تین چیزوں کے بند ہو جانے پر افسوس کیا ہے:

نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام،

یہی دکھڑا اس فارسی قصیدہ میں بھی رویا ہے۔ اپنی قدیمی مداحی و وظیفہ خواری کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

بہ ناگرفت جہاں صرصرے وزید بدہر — کزاں بر آئینۂ آسماں غبار آمد
شرارہ بار غبارے زمغز خاک نگیخت — سیاہ رد سپہے کاندریں دیار آمد
دریں جگر گسل آشوب کز صعوبت آں — سپاہدار سپہرے بہ زینہار آمد
گواہ دعوی غالب بعرض بے گنہی — ہمیں بس ست کہ ہرگونہ رستگار آمد

یعنی غدر کی باد صرصر سے مصائب کا غبار چھا گیا، اس زمانے میں میری بے گناہی کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا اور اس لئے کوئی مخالفانہ کارروائی میرے مخالف حکام نہ کر سکے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اب آپ سے طالب لطف و کرم و تلافی مافات ہوں:

کنوں کہ شد ز تو زینت فزائے روئے زمیں
سواد ہند کہ چوں زلف تار و مار آمد
خطاب و خلعت و پنشن ز شاہ می خواہم
ہم از نخست بدیں دایہ ام قرار آمد
پس از سہ سال کہ در رنج و پیچ و تاب گزشت
سر گذارشں اندوہ انتظار آمد

یہاں بھی انہی چیزوں کو طلب کیا ہے اور لکھا ہے کہ تین سال سے

حالت پر گذر چکے ہیں۔

غالباً اس قصیدے کے گزراننے کے بعد شملہ سے تحقیقات کی گئی اور جب ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی تو بدستور پنشن جاری کر دی گئی تین سال کی پچھلی مجموعی رقم بھی دیدی گئی تھی، اس سے مرزا صاحب بہت خوش ہوئے تھے۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لئے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اُن میں سرسید مرحوم بھی تھے۔ اس واقعہ سے سید صاحب اور مرزا مرحوم میں صفائی بھی ہو گئی جن کے باہمی تعلقات قدیمانہ آئین اکبری کی تقریظ کے قصہ سے کچھ مکدر ہو گئے تھے۔

بہر حال اس غیر مطبوعہ قصیدے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہے اور ۳ر جنوری کے دربار سے مقصود دربار آگرہ ہے۔ امید ہے کہ مرزا مرحوم کے اُن عقیدتمندان کمال کے لئے جن کی تعداد اب ملک میں روز افزوں ہو رہی ہے، یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بہت دلچسپ ہوگا۔ گو شاعری کے اعتبار سے چنداں اہم نہ ہو۔

رحمۃ اللہ علیہ و غفر اللہ ذنوبہٗ!

قصیدہ

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرماں روائے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب امیر شہ احتشام

جم رتبہ منٹگمری بہادر کہ وقت رزم
ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام!

جس بزم میں کہ ہو انھیں آئین مے کشی
وہ آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام!

قطعہ

چاہا تھا میں نے تم کو مہ چار دہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام!

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام!

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

سمجھا اسے گر آب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام

عزت یہ اہل نام کے ہستی کی ہے بنا — عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب — تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کشمکش میں آپ کا مداح نامور — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کر سکا وہ لکھا حضور کو — دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں — سلطان بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو — شاہان عصر چاہیئے لیں عزت اس سے وام

خود ہے مدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام

امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال — بارے قدیم قاعدے کا چاہیئے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو — چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستور فن شعر یہی ہے قدیم سے — یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیر نگیں آپ کے رہے
اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

تعلیم اور تعلیمی ادارے

۱۔ گورنمنٹ کی تعلیمی حکمت عملی	الہلال ۴ جون سنہ ۱۹۱۳ء
۲۔ ندوۃ العلماء	" ۱۱، ۱۸، ۲۵ مارچ سنہ ۱۴ء
۳۔ نشۂ شام کی نصف شب	" ۲۵ اگست یکم ستمبر سنہ ۱۲ء
۴۔ نشۂ نیم شبی کا صبح خمار	" ۵، ۲۶ فروری ۵، ۱۳ مارچ سنہ ۱۳ء

مُسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ

کی

تعلیمی حکمتِ عملی

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ	جو لوگ منکر ہیں، ان کے کام ایسے ہیں جیسے
بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً،	چٹیل میدان میں ریت، کہ پیاسا اس کو دور سے
حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ	پانی سمجھ کر دوڑتا ہے، مگر جب اس کے پاس
شَيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ	آیا تو کچھ بھی نہ پایا، پایا تو اللہ کو اپنے قریب
حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ	پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا، اور اللہ جلد ہی
(۳۹ : ۲۴)	حساب کر دینے والا ہے۔

"تعلیم صحیح ایک ایسے درخت کے مشابہ ہے جو کسی نہر کے کنارے اپنی نادری وسطبری و سرسبزی کی بہار دکھا رہا ہو۔ یہ درخت کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک ننھے اور ذرا سے بیج نے اس کو درخت بنایا ہے، جو درخت کے تمام افعال و

خواص پر حاوی ہے، اور جو اس وقت خاک میں چھپا ہوا ہے۔ انسان بھی اسی درخت کے مشابہ ہے۔ بچوں میں دیکھو، وہی تمام قوتیں مخفی و مستور ہیں، جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہیں۔ انسان کی تہذیب صرف ادبی و اخلاقی حالت کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔"
(ہنری پسٹالوزی)

ہندوستان کی تعلیمی رفتار نے دماغی قوی پر جو ناگوار اثر ڈالے ہیں، طبیعتیں جس طرح کند ہوگئی ہیں، ابھرنے والی فطری طاقتوں پر جو گراں بار دباؤ پڑا ہے، قوائے ذہنیہ کی پامالی میں جیسی دست درازیاں اس نے کی ہیں، اس کی خارجی نظیر اگر ہو سکتی ہے، تو "رابرٹ جسگرڈ" اور اس کے بھائی "راجیر" کی وہ حکمت عملی جس کی رو سے ایک طرف تو ۱۰۶۰ء میں جنوبی اطالیہ کی عربی سلطنت پامال کر کے اسلامی دنیا سے عربوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع کر دئے گئے، اور دوسری طرف اس خیال سے کہ ملک کی تمدنی و صناعی و علمی اہمیت کے اجزائے عظمیٰ ان دنوں صرف عرب تھے، ان کو یہ امتیازی رعاتیں بھی دی گئیں کہ مسیحی گورنمنٹ کی نگرانی میں انکی تعلیم گاہیں برقرار رہیں، جن میں ان کی اولاد کو ایسی تعلیم، جو منشائے حکومت کے مطابق ہو، سرکاری خرچ پر دی جائے۔ اس وقت تو ان مراعات کی قدر و قیمت کا عام اعتراف ہوا تھا لیکن حکومت نے جو سیاسی بندشیں ان کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں، قومی ترقی کے لئے وہ اسی قدر مہلک ثابت ہوئیں کہ قومیت میں روز بروز اضمحلال آتا گیا اور آخر یہ حالت ہوگئی کہ تھوڑے ہی زمانے میں عرب یا تو بالکل ہی فنا ہوگئے یا کچھ رہے بھی تو نصرانیت کی تہذیب نے ان کو اپنے اندر مدغم

ہمارے ملک میں اصلاح تعلیم کا خیال تو گورنمنٹ کو اب ہوا ہے اور خاصۃً مسلمانوں کے متعلق ابھی ۲ مئی ۱۹۱۲ء کو تعلیمی سرکلر شائع کیا گیا ہے، لیکن یورپ میں اس کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے دوش بدوش ہے۔ ہنری بسٹالوزی متوفی ۱۸۲۲ء (جس کے الفاظ اس مضمون کے طغرائے عنوان ہیں) تہذیب نظام درس کے عوامل محرکہ میں پہلا شخص تھا۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے:-

"آج کل تعلیم کے جو طریقے رائج ہیں ان کے اتباع نے یورپ کو بڑی سخت غلطی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ غلطی ہی نہیں وہ آپ اپنے سامان ہلاکت میں ہے۔ ایک طرف تو وہ اعلیٰ درجے کے علوم و فنون و صنائع میں ترقی کے فلک الاعلیٰ پر پہنچ گیا ہے اور دوسری طرف تعلیم طبیعی کی وہ بنیاد ہی کھو بیٹھا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ سب کو ایک تعلیم دینی چاہیئے، اور سب کی تعلیم ان کے ذوق طبیعی کے موافق ہونی چاہیئے مجھے معلوم نہیں کہ یورپ کی طرح دنیا کا کوئی اور حصہ ترفع کے اسی درجہ تک بلند اور پھر ہبوط کے ایسے قعر میں گر گیا ہو۔ ہمارے براعظم کی یہ حالت اس مجسمے مشابہ ہے جس کی تصویر پیغمبروں نے کھینچی تھی کہ اس کا سر تو سونے کا ہے مگر پاؤں (جس پر یہ سر قائم ہے) ٹھیکری کے بنے ہیں! یورپ نے اپنے ان تعلیمات کے ذریعہ سے قوم کو محبت و الفت و دانائی و حکمت و مدرکات و جذبات کے لباس سے برہنہ کر کے، اس کے دماغ میں انس پسندی سے وحشت، ایمان سے تنفر اور توہمات و خرافات سے دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ اس خلل کا سدّ باب میری رائے میں یہ ہے کہ سطحی تعلیم کو ترک کر کے عقلی و ذہنی تعلیم کو ترقی دی جائے، اور حقیقی معرفت کے مصدر و منبع کی جانب رجوع ہو۔"

یہ وہ الفاظ ہیں، جو یورپ کی تعلیمی حالت کے متعلق کہے گئے تھے، جس کی علمی ترقی، اس زمانہ میں بھی مسلّم تھی، مگر صد حیف ہے ہندوستان پر، جو اس طویل و عریض انگریزی عہد حکومت میں علم کے صحیح مفہوم تک سے آشنا ہونے نہ پایا!!

حال میں تعلیم کی نسبت جو سرکاری سرکلر شائع ہوا ہے، اس نے مسئلہ تعلیم و اصلاح کو از سر نو چھیڑ دیا ہے۔

مسلمانوں کی قومیت کے آج کل جو مخصوص ترکیبی عناصر ہیں، ان سب میں شکر گذاری و ممنونیت کا عنصر ہر ایک پر غالب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرکلر میں گورنمنٹ کی جانب سے جس سلسلہ احسان کا اعلان ہوا ہے، اس کی منت پذیری کے جذبات سے تمام قوم کے سینے لبریز ہو رہے ہیں۔ یہ احساس واقعی میں قابل تعریف ہے اور بہبود عامہ کی ذیل میں حکومت کا جو قدم آگے بڑھے، رعایا کا فرض ہے کہ اس کا خیر مقدم بجا لائے، اور اس کی قرار واقعی عزت کرے، لیکن جب اس کی اشاعت سے خود گورنمنٹ کا مدعا یہ ہے کہ نفاذ احکام سے پیشتر استشارہ و استصواب کر کے مسئلہ کو منقح کر لیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس باب میں آزادی سے بحث نہ ہو، اور عام رائے کو اصلی معنوں میں آشکارا نہ کیا جائے؟

عہد قدیم کے ایک گنوار عجمی نے ایک نامور عرب (حنظلہ بن صفوان) سے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ "حسن اور حسین (یعنی حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما) کس پیغمبر کی لڑکیاں تھیں؟ اس نے جواب دیا کہ "خدا کے لئے اس ایک جملہ میں کوئی ایک بات تو درست کہی ہوتی!" یہ بحث ضروری نہیں کہ اس واقعہ میں اور موجودہ سرکلر میں کس حد تک مماثلت موجود ہے؟ البتہ اس حقیقت کو

بے نقاب کردینا ضروری ہے کہ سرکلر کی خامیاں پختہ مغزان نقد و نظر کے لئے نہایت مایوسی کا باعث ہوئی ہیں۔

(۱) اسلام اور تعلیم میں قدرتی لزوم ہے، اس لئے ہر ایک مسلمان کی یہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم یافتہ ہو۔ عہد رسالت میں صرف اظہار ایمان ہی پر قناعت نہ تھی، بلکہ یہ بھی تقید تھا کہ ہر ایک مسلمان بقدر میسور قرآن کریم کی تعلیم بھی، کہ اس زمانہ میں وہی ایک تعلیم تھی، حاصل کرے۔ اس کے لئے اتنے ترغیبی احکام تھے کہ ضروریات زندگی کے اہم اوصاف حتیٰ کہ بیع و شری اور مہر نکاح تک میں ادائے معاوضہ کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ قرآن کی تعلیم دینے سے یہ حق ادا ہوجاتا ہے۔ اسی خصوصیت پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ اعلیٰ تعلیم تو معدوم ہے ہی، ابتدائی تعلیم میں بھی مسلمان کتنے پیچھے ہیں؟ با ایں ہمہ سرکلر میں بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں مسلمانوں کی جماعت ہر طرح فوقیت رکھتی ہے۔

(۲) ہندوستان کے تمام طبقات و عناصر میں اگر زبان اُردو کی عمومیت کو بحث میں نہ بھی لایا جائے، جب بھی اس قدر ماننا پڑے گا کہ تمام انطاع کے مسلمانوں میں اردو سمجھی جاتی ہے، علمی پہلو سے ہر جگہ اسی زبان کی حکومت ہے اور جہاں دوسری بولیاں رائج ہیں وہ بھی اصل میں زبان نہیں ہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ زبان کے لہجے ہیں، اور ان میں بھی اردو دخیل ہے پھر بھی گورنمنٹ کی رائے ہے کہ بہت سے انطاع ایسے ہیں جن میں مسلمانوں نے اردو کا استعمال بالکل ترک کردیا ہے۔"

(۳) یہ درست ہے کہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ذریعہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں مسلمانوں کو سخت سے سخت زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ غالب تعداد کے مدارس ثانویہ (سیکنڈری اسکولوں) کا انتظام بہت کم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کا علاج صرف یہ بتایا گیا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے خاص خاص کالج و اسکول قائم کرنے سے یہ دقتیں جاتی رہیں گی" سوال یہ ہے کہ ان مخصوص درسگاہوں کا سلسلہ اتنا وسیع تو ہوگا نہیں کہ تمام اسلامی آبادی کے لئے کافی ہو سکے، لامحالہ عام درسگاہوں کے ذریعے سے یہ کمی پوری کرنی پڑے گی۔ پھر ان درسگاہوں میں یہ مشکلیں کیونکر آسان ہوں گی؟

(۴) مدرسۂ عالیہ کلکتہ، اسلامی کالج لاہور، اور اسلامی اسکولوں کی اصلاح کی تجویز پیش کی گئی ہے، جو نہایت عمدہ بات ہے۔ اگر اس تجویز پر قابل و تجربہ کار مصلحوں کی اعانت سے عملدرآمد ہوا، اور تعلیمی و انتظامی معاملات میں مسلمانوں کی آزادی سلب نہ ہوئی، تو بے شبہ یہ ایک بہت ہی کامیاب و معقول صورت ہوگی۔ مگر خوف زدہ پبلک کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ ہوگلی کالج، حسین آباد اسکول، اور مرزا محسن مرحوم کے وقف اسٹیٹ کے لئے بھی ابتداً میں تحریک اصلاح ہی پیش ہوئی تھی، مگر اصلاحی مداخلت نے تھوڑے ہی دنوں میں ان سب کے نظم و نسق سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا، نیشنل اسکول اعظم گڈہ اور کاظمین اسکول لکھنؤ اسی بہانہ سے ٹوٹے ہیں، اور اسی مادّے کی اصولی صورت گری ہے، جس نے مدرستہ العلوم کی حکومت میں غیروں کو مسلمانوں کی جگہ صاحب نفوذ و حکومت بنا رکھا ہے۔

(۵) پرائیویٹ انتظام کے ذریعے سے اسلامی ہوسٹلوں کی تجویز نہایت مبارک ہے، لیکن کیا حقیقت میں یہ ہوسٹل غیر سرکاری مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونگے؟ کیا واقع میں اسلامی خصوصیات کے مطابق یہاں تہذیب نفس کا انتظام ہوگا؟ اور کیا بغیر ان باتوں کے ہوسٹلوں سے کسی مفید و سودمند نتیجہ کی امید حق بجانب ہوسکتی ہے؟

اب ان اصلاحات کا مقابلہ یورپ کی تعلیم وطرز تعلیم سے کیجئے جس کو ہندوستان کی تعلیمی زندگی کے لئے مثال و نمونہ کے طور پر ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے، اور یونیورسٹی کے ہر ایک کانووکیشن میں ہندوستانیوں سے اسی کے اتباع کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس تعلیم کے خاص خاص اصول یہ ہیں:-

(۱) تعلیم اس خارجی ترقی کا نام نہیں ہے جو انشا و لغت و ادبیات کی سطحی معلومات پر قائم ہو، اصل میں تعلیم ان مخفی قوتوں کے اظہار کا نام ہے جو فطرت نے انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہیں۔ علم النفس (سائیکالوجی) کے اصول پر آج یورپ میں جس تعلیم کا رواج ہے اس کا مدعا یہی ہے کہ ان خیالات کو عملی صورتوں میں لاکر درسگاہ عمل کا ایک جز بنایا جائے۔

(۲) تعلیم کا پہلے یہ انداز تھا کہ علم کو محنت و کوشش سے حاصل کیا جائے اور انسان کو محنت و کوشش کا خوگر بنایا جائے۔ اب یہ اسلوب ہے کہ تعلیم کا نقطۂ مرکزی صرف نفع رسانی و نفع رسانی ہے۔

(۳) تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ نقد و اختیار و توسیع معلومات کے ذریعے سے انسانی قویٰ کو ترقی دی جائے۔

(۴) درسگاہوں میں طرز تعلیم کی اصلاح کی جائے اور درس دینے والوں کو نمونہ تہذیب بنایا جائے، تاکہ وہ اپنے فرائض کو نہایت کامیابی سے ادا کرسکیں۔

(۵) تلامذہ کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ ہو، ان کی ذہنی وعقلی و دماغی حالتیں ملحوظ رہیں، اور درس میں ہر ایک متعلم کی منفعت و مذاق طبیعت کو زیر نظر رکھا جائے۔

(۶) ابتدائی تعلیم کا پورا پورا اہتمام ہو۔

(۷) تعلیم کا مقصد افراد کو ترقی یافتہ بنانا ہو۔

(۸) تعلیم کے لئے فرض ہے کہ ایسے طرز وطریق پر دی جائے کہ دنیا کا ہر ایک فرد اپنی عقلی مقدرت وطبعی استعداد کے مطابق خاطر خواہ ترقی کرسکے۔

کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں کہیں بھی ان باتوں کا نام ونشان ہو؟ وہ تعلیم جس کی بنیاد محض گورنمنٹ کی مخصوص ضرورتوں کے لئے پڑی ہو، جس کے نصاب حقیقت میں، وضع واقناد میں، اسلوب و پرداز میں، استعباد کا جوہر ہر ایک چیز پر غالب ہو، جس کا منشائے عمل ہی یہ ہو کہ تعلیمی ڈگریاں، غلامی کی ذلیل زندگی بسر کرنے کا آل تمغا ثابت ہوں، جو افراد کے دماغی تنزل کو ترقی دینا چاہتی ہو، جو عقلی مقدرت وطبعی استعداد کے دبائے رکھنے کی حامی ہو، جس کے حکام فیصلہ کرچکے ہوں کہ ہندوستان کے لئے پرائمری ایجوکیشن کا لزوم سودمند نہیں ہے، جس کے ذریعے سے انشاء و لغت وادبیات کی سطحی معلومات میں بھی کامیابی نہ ہوتی ہو، جس کا خاص نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ فطرت انسانی کی مخفی طاقتیں کسی حالت میں بھی ظہور پذیر نہ ہوسکیں

جس کے انداز درس میں نقد و اختیار و توسیع معارف کی گنجائش ہی نہ رکھی گئی ہو، جہاں درس دینے والے اپنے فیشن کے لحاظ سے بہترین نمونۂ تہذیب، اور اپنے کیرکٹر کی بنا پر بدترین تمثال بربریت و وحشت نظر آئیں، جو اساتذہ کو تلامذہ کے ساتھ ذلت آفریں خشونت کا برتاؤ سکھاتی ہو، جو ایک عجیب و غریب معنی میں اصول مساوات کی اس شدت سے پابند ہو کہ طلبا کی ذہنی و عقلی و دماغی حالتیں خواہ کیسی ہی مختلف ہوں، اور ہر ایک کے ذوق طبیعت میں چاہے کتنا ہی تباین محسوس ہوتا ہے، مگر سارے گلے کو ایک ہی لٹھ سے ہنکایا جائے، اور تمام طبقات مختلفہ کو ایک ہی قسم کی بے نمک تعلیم دی جائے، ایسی تعلیم اور اس تعلیم کا اصلاحی منشور (سرکار) اگر کسی قوم کی کامیاب زندگی میں معاون ہو سکتا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ قدرت نے نتائج میں غلطی کی، ورنہ محکوم مسلمانان سسلی کے لیے وہاں کی مسیحی گورنمنٹ کے فرمان مراعات کو اصل میں آیۂ رحمت ثابت ہونا چاہیئے تھا!!

یورپ میں طرز تعلیم کے کیا اصول ہیں؟ اس کا معیار حقیقت یوں قائم کیا گیا ہے

(۱) طرز تعلیم میں اصلی چیز نقد و نظر ہے۔

(۲) ہر ایک شاخ میں درس کی ابتدا سادہ و سرسری اصول سے کر کے دقیق مسائل تک اس کو بتدریج پہنچانا چاہیئے۔

(۳) مسئلہ جب تک منقح ہو کر متعلم کے ذہن نشین نہ ہو جائے معلم کو آگے نہ بڑھنا چاہیئے۔

(۴) طرز تعلیم کو صرف عقل کے ترقی دینے والے مسائل کے دائرے میں محدود رہنا چاہیئے۔ مباحث علمیہ کے دوران میں دماغوں پر غیر علمی تسلط بٹھانا، یا علمی اصول میں مذہبی تحقیق کو غلط ملط کر دینا، دماغ کے لئے ایک تشویش آفریں چیز ہے۔

(۵) تلامذہ کی شخصیت قابل احترام ہے۔

(۶) تعلیم کا یہ نتیجہ ہونا چاہیئے کہ انسان میں جو قوتیں مخفی ہیں، وہ آشکار ہو جائیں یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے کہ دل میں نئی قوتیں ڈال دی جائیں۔

(۷) قوت کو معلومات، اور ذکاوت کو تعلیم سے آمیزش دینی چاہیئے۔

(۸) معلمین و متعلمین کے مابین جو بزرگانہ تعلقات ہوں ان کی عمارت اس داغ بیل پر تعمیر ہونی چاہیئے، جس کی بنیاد دراصل تعلیم رسالت نے ڈالی تھی کہ "لیکرم کبیرکم ولیرحم صغیرکم" تم میں جو بڑے ہوں ان کی بزرگ داشت کی جائے، اور جو چھوٹے ہوں ان کے ساتھ رحمت و مہربانی کا برتاؤ ہو۔

(۹) طرز تعلیم کی خاص غرض تہذیب نفس سمجھنا چاہیئے۔

سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ کی نظارت معارف (سر رشتہ تعلیم) میں کیا اسی طرز پر تعلیم دی جاتی ہے؟ اور کیا موجودہ اصلاحی منشور اس دل آویز و خوشگوار توقع کی ضمانت ہو سکتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اب انہیں اصول پر تعلیم دی جایا کرے گی؟ سرکلر میں جب ان توقعات کی تکمیل کا نام و نشان ہی نہیں ہے، جب طرز تعلیم میں نقد و نظر سے علاقہ ہی نہیں رکھا گیا، جہاں مسائل کے افہام و تفہیم کے لئے کوئی اسلوب تدریج ہی نہ ہو، مباحث درسی کو طلبا سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر

درسگاہ کی حاضری پوری ہوجائے، مدرسین کا یہ فرض ہو کہ مقدار مقصودہ تک کے لئے اپنے روزانہ لکچروں کا وظیفہ پورا کردیا کریں، عقلی ترقی کے محرکات سے علاقہ نہ ہو، تلامذہ کی شخصیت کا احترام غیرضروری سمجھا جائے، کوشش کی جاتی ہو کہ اس طرز تعلیم سے متعلمین کی بہترین مخفی قوتیں مخفی تر ہوجائیں، ان کے دلوں میں نئے نئے قسم کے قوی استعداد پیدا ہوں، تہذیب نفس کی غرض تدنیس قلب سے آلودہ رہے، متعلمین و معلمین کے مابین اکثر اوقات میں خاص قسم کے تعلقات رہا کریں، تو پھر ان حالات میں یہ اصلاحی نمائشیں کیا مفید ہوسکتی ہیں؟ اور ان پر شکریے کے رزولیشن پاس کرنے کے کیا معنی ہیں؟

یورپ کی بیشتر مسیحی طاقتوں نے دنیائے اسلام کو جن ہولناک و ہلاکت افزا مصائب کا آماجگاہ بنا رکھا ہے، اس کے زخم ایسے اوچھے نہیں ہیں کہ معمولی مرہموں سے مندمل ہوجائیں۔ وہ قوم جس کو فنا کرنے کی علانیہ تدبیریں ہو رہی ہوں، اگر ترقی کی اصلاح سرسری تجویزیں ہی اس کو پامال ہونے سے بچا سکتی ہیں، تو کوئی شک نہیں کہ شیخ شیرازی کی۔

"خانہ از پائے بست ویراں است"

خواجہ در بند نقش ایوان است

والی حکایت میں

کی مینا کاری، مکان کو انہدام سے محفوظ رکھنے کی سب سے اچھی ترکیب ہی ہوگی۔

یہ وہ اصول ہیں جن پر ممالک یورپ کی ہر ایک درسگاہ میں عمل درآمد فرض ہے، اور جن کے طریق عمل میں بہت کم اختلافات پیدا ہوئے ہیں، لیکن اب سمجھ

دنوں سے فرعیات میں بعض اور اصلاحیں شروع ہوگئیں ہیں، جن کے اہم پہلو یہ ہیں
(۱) تعلیم و طرز تعلیم سے خاص غرض یہ تھی کہ تلامذہ کے قوی عقلیہ آراستہ ہوجائیں، لیکن اس کی کوئی سہل الوصول ترکیب متعین نہ تھی۔ اب اس کی یوں تحدید کی گئی ہے کہ صرف اعمال ادراکیہ سے اس میں کامیابی ممکن ہے۔
(۲) مصلحین نے اب تک طبیعیات کی تعلیم مقدم رکھی تھی، یہ تقدم تو اب بھی یک گونہ مسلم ہے، اور آج دنیا میں سب سے زیادہ فزیکل سائنس ہی کو فروغ دینے پر زور دیا جاتا ہے، مگر اہل نظر کی رائے میں قومیں عموماً زبان کی ترقی یا تنزل سے بنتی بگڑتی ہیں، اس لئے ادبیات کی تعلیم کو طبیعیات پر ترجیح حاصل ہے۔
(۳) پہلے جغرافیہ و حساب و سائنس کے درس پر زیادہ اصرار تھا، لیکن اب اس کی جگہ زبان و ادب تاریخ کو ملی ہے۔
(۴) اب تک تعلیم نفسی کی حمایت کی جاتی تھی، قدیم فلسفۂ عقلیہ کی تعلیم سے انکار تھا، لیکن اس کی قائم مقام کوئی اور چیز نہیں رکھی گئی تھی۔ اب یہ جگہ فزیکل سائنس سے معمور کی گئی ہے، جس کے لئے پہلے صف اولین میں ممتاز گنجائش نکالی گئی تھی۔

یہ اصلاحیں اصولی و عمومی حیثیت سے یورپ میں تسلیم کرلی گئی ہیں، اور اب ایک مدت سے یورپ کے تمام اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں یہی اصول زیر عمل ہیں، اور انھیں کے وہ نتائج ہیں جو "نپلین" و "مارکونی" "ونبکر" "ڈگسن" کی صورتوں میں نمایاں ہوکر زمانہ کو مجبور کردیتے ہیں کہ ہر ایک قسم کی علمی و عملی ترقی میں یورپ کے قدموں پر سر جھکادے۔ لیکن کیا ہندوستان میں بھی کوئی ایسا انتظام ہے

یا گورنمنٹ کی مہربانی سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے قوائے عقلیہ آراستہ و مہذب بن جائیں، طو مارزس ہیں اعمال اور اکیہ کے لئے بھی کوئی گنجائش نکلے ؟ قومی زبان، قومی لٹریچر، اور قوم کی تاریخ سے بنائے قومیت استوار ہو سکے ؟

اسلام نے مسلمانوں کو ہمیشہ ظاہر فریبیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے، جس قوم پر ہر جانب سے افلاس محیط ہو، جسے تعلیم کے ناکام نتائج دیکھتے دیکھتے ایک زمانہ گذر گیا ہو، جس کے لئے عموماً ان مقدمات و مبادی کو محمود بتایا گیا ہو جن سے اس کی بے خبری میں اضافہ، اور تنزل میں ترقی ہوتی ہو، ایسی قوم کا علاج سطحی و سرسری دواؤں سے ممکن نہیں۔ گورنمنٹ کے حسن التفات کا بے شبہ قوم کو شکر گذار ہونا چاہئے لیکن اگر یہ تعلیمی منشور انھیں حالتوں میں نافذ العمل ہو گیا اور اصلی و اساسی دقتیں بدستور برقرار رہیں تو مسلمانوں کو صاف کہہ دینا چاہیئے کہ یہ نام نہاد اجزائے اصلاح ان کے درد کی دوا نہیں ہیں۔ ان سے کسی دوسری جماعت کو خوش کرنے میں مدد لینی چاہیئے۔

ما بجائے کہ زدیم مانند، قناعت کردیم
بہ سکندر بہ بہ ہیچ آنچہ زدارا ماندا

ندوۃ العلماء

ندوۃ العلما رجب قایم ہوا تو ہر طرح کے علما رکا ایک وسیع مجمع اور مدعیان ریاست دینی کا ایک سب سے بڑا عرش جلال نظر آتا تھا۔ مگر در اصل اس کی حقیقت سمجھنے والے معدودے چند اشخاص تھے، اور وہی اس تماشا گاہ کا اصلی گرشۂ عمل تھا۔ اکثروں نے اسے ایک دارالوعظ سمجھا بہتوں نے اپنی اظہار مولویت کے لئے اسے نمایش گاہ قرار دیا، بہتوں نے دیکھا کہ مدتوں کے بعد ارباب عمائم کی مقبولیت و ریاست کا ایک میدان کھلا ہے، استقبال و مشایعت کے ہجوم ہیں، اور دعوتوں اور سفر خرچ کے منی آرڈروں کا وسیلہ، پس وہ اس کی جانب دوڑ رہے۔ لیکن اس مفرب مقصد میں دو تین آدمی ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ ہمارا مقصد کیا

ہے اور اس مجمع سے کیونکر کام لینا چاہیے ؟

ابتدا میں اجتماع علما، رفع نزاع باہمی، اشاعت اسلام، تاسیس دارالافتا، وغیرہ وغیرہ بہت سے مقاصد ندوہ کے قرار دیے گئے لیکن ارباب فکر نے دیکھا کہ یہ سب بے سود ہے۔ اصلاح و عمل کے تمام ارادے یہاں آکر رک جاتے ہیں کہ وہ آدمی نہیں جو ان کاموں کو انجام دیں۔ پس اولین کار یہ ہونا چاہیے کہ ایک درس گاہ قایم کی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ اصلاح نصاب کا مسئلہ ابتدا سے مقاصد میں رکھا گیا تھا، لیکن صرف سالانہ جلسے ہوتے تھے اور لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ کوئی مقصود عملی سامنے نہ تھا۔

چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے "دارالعلوم" کا ایک لائحہ (اسکیم) مرتب کیا: اور مولانا محمد علی صاحب کو جو ندوے کے ابتدا سے ناظم تھے دی کہ اپنی جانب سے چھاپ کر شائع کر دیں۔ اس کے بعد میرٹھ میں ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں تجویز دارالعلوم پر تقریریں ہوئیں، اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہر طرف سے صدا اعانت بلند ہوئی۔

اس کے دو برس بعد لکھنؤ میں دارالعلوم قایم ہو گیا اور تعلیم شروع ہو گئی

مقامی گورنمنٹ کی بدگمانی

خدمت انسانی کا کوئی کام آزمایش سے خالی نہیں ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر شے کے لئے خدا کا ایک نظام قانون ہے، بالکل اسی طرح ایک قانون ابتلا و امتحان بھی ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ

حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِیْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ

اب تک ندوہ سرکار کے لئے ایک بے غل و غش مائدہ لذائذ اور سفرۂ نعائم تھا، لیکن اب یکا یک اس کی زندگی کی پہلی اور سب سے بڑی آزمایش شروع ہوگئی۔ بعض اسباب (جن کی یہاں تفصیل موجب طوالت ہوگی) ایسے پیش آئے کہ صوبے کی گورنمنٹ کو ندوہ کی طرف سے خواہ مخواہ سیاسی بدگمانیاں پیدا ہوگئیں اور بعض لوگوں نے اس سوء ظن کو اور زیادہ قوی کردیا۔ اس وقت صوبے کا حاکم اعلیٰ سر انٹونی میکڈانل تھا جس کو ندوہ کے وجود ہی سے بدگمانی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ علمار کا جمع ہونا اور مذہبی تحریک کی پکار ضرور کسی نہ کسی پوشیدہ منصوبے پر مبنی ہے مولانا شبلی بھی اسی لئے ترکی گئے تھے، اور صرف اسی لئے مذہب مذہب پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے علانیہ مولانا کی نگرانی کا پولیس کو حکم دیدیا اور مشتبہ اشخاص میں ان کا نام لکھ لیا گیا!

بدقسمتی سے ایسا ہی خیال مذہبی دعوت کی نسبت آج کل بھی بعض حکام کا ہے۔

وہ اس خیال پر کچھ اس طرح جم گیا کہ اس کا دفعیہ محال ہوگیا۔ اس کی نظر بدلنی ہی تھی کہ یکایک ندوہ کا عروج معلق میں آگیا۔ بربادی و تباہی کے تمام سامان ایک ایک کرکے فراہم ہوگئے۔ جس قدر امرار و ارباب دول ندوہ کے ساتھ تھے اور دار العلوم کے لئے روپیہ دینا چاہتے تھے ان کے لئے صرف اس قدر علم ہی کافی تھا کہ صوبے کا حاکم اعلیٰ ندوہ کو اچھا نہیں سمجھتا

انھوں نے مخالفانہ روتبرا شروع کردیا۔

اس کے بعد شرکار ندوہ اور عہدہ داران جمعیتہ کی باری آئی فی الحقیقت یہی وقت اصلی آزمائش کا تھا، مگر بھلا وہ لوگ جنھوں نے ندوہ کو ایک منزل عیش سمجھکر اپنے اپنے خیمے گاڑ دئے تھے، اس طرح کانٹوں سے بھرا دیکھ کر کب جمنے والے تھے؟ منشی اطہرعلی مرحوم نے ندوہ کو خراب کیا تھا۔ ندوہ کے تعلق نے انھیں برباد کیا۔ وہ حیدرآباد چلے جانے پر مجبور ہوئے۔ مولانا محمد علی حج کے لئے چلے گئے، اور پھر نظامت سے استعفا دے دیا۔ اب نہ وہ جلسوں کے واعظ تھے، نہ مجالس کی صدارت کے خواستگار۔ وہ غلغلے جنھوں نے تمام ہندوستان کو یکسر اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا، ایک دو سال کے اندر ہی اندر اس طرح بیٹھ گئے گویا کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ندوہ، ندوہ کا وجود، اس کی مجالس، اس کا نام، اس کا مدرسہ، ایک از یاد رفتہ خواب بن کر لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہوگیا۔

نارِوا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقی گشتم و از طالعِ دکان رفتم

ندوہ جب تک رجوع خلائق کا مرکز، جمع مال میں کامیاب، اور ہنگامہ و نمایش کا وسیلہ تھا، اس وقت تک اس کا میدان دل فریب، اور اس کی جیب پُراز زر تھی۔ پس وہ اپنی ایک صدا سے سینکڑوں عالموں، صوفیوں، واعظوں، اور خطیبوں کو اپنے علم کے نیچے جمع کرلیتا تھا، اور

اس کا دستر خوان جب بچھتا تھا تو بڑی بڑی متبرک صفیں اس کے یمین و یسار نظر آتی تھیں۔ پر اب وہ مفلس ہو گیا۔ اس کا گھر غربت کدہ اور اس کی جیب خالی ہو گئی۔ زمانے نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیریں اور اس سے صاحب سلامت رکھنے والوں کے لئے بحکم حکومت روک ٹوک ہونے لگی۔ ایسی حالت میں کسے پڑی تھی کہ اس کی طرف جھانک کر بھی دیکھتا۔ اور اس بیکس کے لئے اٹھتا جواب دینے سے عاجز تھا اور خود محنتوں، ہمتوں، قربانیوں اور صرف وقت و مال کا طالب تھا؛

دوسری نظامت

مولانا محمد علی کے مستعفی ہو جانے کے بعد ناظم کی تلاش ہوئی مگر اس وقت نہ تو مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری نے اپنے احق بالخلافۃ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کسی دوسرے ہم مقصد نے۔ مولوی خلیل الرحمن صاحب ایک تاجر آدمی ہیں۔ دکاندار آدمی ہی اچھی طرح اس نکتے کو سمجھتا ہے کہ خرید و فروخت میں متاع کو قیمت سے زیادہ بہتر ہونا چاہیئے وہ نیپال کے جنگل میں جس اصول کو برتتے تھے اس کو بازار ندوہ کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ اس وقت تک ندوہ کی نظامت کی اتنی کم قیمت بھی نہ ہوئی تھی کہ ہر دو کاندار بولی دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ غرضکہ مولوی مسیح الزماں صاحب مرحوم شاہجہانپوری ندوہ کے ناظم قرار پائے۔

یہ نظامت محض برائے نام تھی۔ مولوی صاحب مرحوم ان کا مول کے

آدمی نہ تھے۔ اور اصلی پیچ گورنمنٹ کے تعلق کا پڑا تھا۔ وہ خود شاہجہانپور میں رہتے تھے۔ دفتر بھی وہیں اٹھوا لیا اور جیوں توں کچھ زمانہ گذر گیا۔ مگر ندوہ کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ آمدنی کچھ نہ تھی۔ چندوں کا سلسلہ بالکل موقوف تھا، فنڈ کا وجود نہیں۔ اشخاص ناپید تھے

حیات بعد الممات

مولانا شبلی نعمانی اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے اور برابر ارادہ کر رہے تھے کہ ندوہ کے لئے اپنا پورا وقت دے دیں۔ کلکتہ اور مدراس کے جلسوں میں اس کا اعلان بھی ہوا تھا۔

بالآخر ۱۸۹۶ء میں مولانا شبلی نے آخری فیصلہ کر لیا اور حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے تاکہ ندوہ کی از سر نو تحریک شروع کر دیں۔

اسی زمانے میں مولوی مسیح الزماں مرحوم نے استعفا دے دیا اور وجہ بظاہر یہ بتلائی کہ وہ لکھنؤ میں قیام نہیں کر سکتے۔ آیندہ کے لئے طریق عمل یہ طے پایا کہ کسی دوسرے شخص کو اب ناظم بنانے کی ضرورت نہیں اور نہ یہ مسئلہ اس وقت حل ہو سکتا ہے۔ کاموں کو تقسیم کر دینا چاہیئے ناظم کی جگہ تین مختلف صیغوں کے علیحدہ علیحدہ سکرٹری مقرر ہوں جو اپنے اپنے صیغہ کا کام کریں۔

اس بنا پر جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ماہ صفر ۱۳۲۳ھ نے طے کیا کہ مندرجہ ذیل اصحاب سکرٹری مقرر ہوں۔

صیغۂ تعلیم و دارالعلوم کے لئے: مولانا شبلی نعمانی

صیغۂ مراسلات " " " مولانا عبدالحی
" مال " " منشی احتشام علی

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اس جلسے سے پہلے بھی دارالعلوم کے معتمد (سیکرٹری) تھے۔ مولوی مسیح الزماں مرحوم کی نظامت کے زمانے میں (۱۶ مارچ ۱۹۰۳ء کو) شاہجہانپور میں مجلس انتظامیہ کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں مولانا محمد علی ناظم اول، مولانا عبدالحیٔ مددگار ناظم، اور خود مولوی مسیح الزماں مرحوم بھی شریک تھے۔
اسی جلسے میں قرار پایا کہ مولانا شبلی دارالعلوم کے معتمد منتخب ہوں پس گویا اس جلسے نے سابق کی قرارداد کو برقرار رکھا اور دوسرے صیغوں کے لئے بھی معتمد منتخب کر لئے۔
اس کے بعد مولانا شبلی نے دارالعلوم کے لئے کام شروع کیا اس وقت میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس زمانے کے بہت سے حالات میرے ذاتی مشاہدات ہیں نہ کہ سماعیات و روایات۔

دارالعلوم ۱۹۰۶ء میں

ایک سرسری نظر اس حالت پر ڈال لینی چاہئے جو ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم کی تھی جب کہ مولانا شبلی کی معتمدی شروع ہوئی۔
دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بلب کے بستر کو دیکھو، یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو۔ اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر پرانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو جن کی بہت

سی دیواریں گر چکی ہیں، اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب گرنے والا ہے
افلاس وفقر، بے نوائی وشکستہ حالی، کس مپرسی ومحتاجی، خرابہ
کار اور بربادی محنت کا ایک ویرانہ تھا، جس کے اندر تباہی وہلاکت کے
آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ ایک ظاہری صورت ضرور قائم تھی۔ مدرسہ تھا
مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو زر و پیہ تھا جس سے تمام کام زندہ
رہتے ہیں، اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی جو بہت سے مادی نقصانوں کی
بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔

مالی حالت

ندوہ کے حیات بعد الممات اور عروج بعد از زوال کے لیے پہلا
کام یہ تھا کہ اس کی مالی حالت درست کی جائے۔ اس واقعہ کی حقیقت
کو کوئی فتنہ نہیں دبا سکتا کہ جب مولانا شبلی نے دار العلوم کی معتمدی اپنے
ہاتھ میں لی ہے تو منشی محمد علی محرر دفتر نے کہا کہ تحویل بالکل خالی ہے۔
ریاست حیدر آباد سے سو روپے ندوہ کو ملتے تھے اور پچیس روپے
بعض دیگر ذرائع سے آتا تھا۔ یہی سوا سو روپے دار العلوم کا مایہ حیات
تھا اور "لا یزید ولا ینقص" ہو کر رہ گیا تھا۔
خرچ بالکل دوگنا تھا یعنی ڈھائی سو روپیہ۔ باقی کمی چندوں سے
پوری کی جاتی تھی مگر ان کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی روزی اور کبھی روزہ!
اعانت کرنے والوں میں امرا گورنمنٹ کے زیر اثر اور گورنمنٹ
مخالف۔ عام ومتوسطین ندوہ کے طرف سے افسردہ ونا امید۔ پس

فراہمی زر کا کام نہایت ہی مشکل ہوگیا تھا۔ تاہم مولانا شبلی نے مختلف اطراف میں سعی شروع کردی۔ سب سے پہلے موجودہ اسلامی ہند کے اولین مبدار فیضان یعنی ریاست بھوپال کا سفر کیا، اور پچاس روپیہ ماہوار رقم مقرر ہوگئی اس سے عام پبلک میں ایک نئی توجہ پیدا ہوگئی اور لوگ یکمشت رقمیں بھی بھیجنے لگے۔ اخبارات میں بھی اب ندوہ کے کاموں کا تذکرہ کیا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی کوشش کی گئی کہ گورنمنٹ کے سوء ظن کو دور کیا جائے اور اس کے لئے مقامی حکومت سے بھی بالاتر مقامات کو توجہ دلائی گئی۔ بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ سرجان ہیوٹ نے مولانا شبلی سے پوچھا کہ وہ گورنمنٹ سے کتنی مدد لینا چاہتے ہیں؟ انھوں نے زمین اور غیر دینی تعلیم کے لئے معقول ایڈ کی درخواست کی۔ ڈائرکٹر نے تمام حالات تحقیق کرکے یادداشت پیش کی بالآخر پانچ سو روپے ماہوار ایڈ مع ایک وسیع و بہترین قطعۂ زمین کے دیا گیا۔

پھر اسی ندوہ کے دارالعلوم کی تاسیس کا، جس کو بغاوت کی تحریک سمجھا جاتا تھا، ایک عظیم الشان جلسہ ہوا اور لفٹننٹ گورنر نے بنیادی پتھر رکھا۔

اس اثناء میں ریاست رامپور سے بھی مولانا خط و کتابت کر رہے تھے۔ ہز ہائنس نواب صاحب نے اعانت کا وعدہ کیا اور شاید چھ سو روپیہ سالانہ وہاں سے بھی مقرر ہوگیا یا کم و بیش۔ ٹھیک رقم

یاد نہیں

تعمیرات

لیکن سب سے بڑا اہم سوال دار العلوم کی تعمیر کا تھا۔ اب تک مدرسہ جس عمارت میں تھا اسے ابتدا سے عارضی سمجھا گیا تھا اور کسی طرح بھی مدرسہ کے لیے کافی نہ تھا۔ نئی عمارت کے لئے سب سے پہلے زمین اور پھر اقلاً ایک لاکھ روپیہ مطلوب تھا۔

مولانا نے تعمیر دار العلوم کے لئے ایک اپیل شائع کی اور مدرسے کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار روپے کا ابتدائی اندازہ کیا۔ یہ اپیل ریاست بھاول پور کے خاندان شاہی تک پہنچی اور خدا تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی توفیق عطا فرمائی کہ پچاس ہزار روپے کے گرانقدر عطیے کا صرف بھاول پور ہی سے اعلان ہو گیا!

بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لئے یہ کارروائی کی گئی کہ آٹھ آٹھ سو روپے کی لاگت کا ایک ایک کمرہ قرار دیا گیا جو اپنے معطی کے نام پر تعمیر ہوگا۔ اس اعلان نے اکثر ارباب خیر کو توجہ دلائی اور روپیہ جمع ہونے لگا (اگرچہ وہ تمام روپیہ خلاف نیت عطا کنندگان دوسرے کاموں میں صرف کیا گیا)

اس طرح مالی مشکلات کی منزل سے ندوہ بہ کمال کامیابی و ترقی گزر گیا۔ مولانا شبلی نے جب اس کو لیا تھا تو سوا سو روپیہ ماہوار آمدنی تھی اور خزانہ بالکل خالی۔ لیکن اب ایک ہزار روپیہ تک ماہوار آمدنی پہنچ

گئی اور دارالعلوم اور بورڈنگ کی عمارت کے لئے ستراسی ہزار روپیہ جمع ہو گیا ۔

اعلان حیات وغلغلۂ کار

ایک شخص جو مرگیا ہے، لوگ کبھی اُسے زندہ نہیں سمجھیں گے اگر وہ بستر پر چند کروٹیں لے کر اپنی زندگی کا ثبوت دینا چاہے گا۔ کیونکہ دنیا اس کی طرف سے مایوسی کا فیصلہ کر چکی ہے، اور یہ فیصلہ جب ہی ٹوٹ سکتا ہے جب کہ وہ اٹھ کر اس طرح دوڑنے لگے کہ لوگ زندہ مان لینے کے لئے مجبور ہو جائیں ۔

یہی حال کاموں اور تحریکوں کا ہے۔ جماعت کی توجہ میں کبھی بھی کوئی ترتیب صحیح یا عقلی باقاعدگی نہیں ہوتی - وہ جب کسی کام کی طرف سے مایوس ہو جاتی ہے تو پھر دوبارہ امید کا پیدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے مولانا شبلی نے ندوہ کے لئے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ جس چیز کو لوگ بھلا چکے تھے، اسے پھر ان کے سامنے کر دیا، اور جس کے لئے مایوسی کا فیصلہ ہو گیا تھا، اس کے لئے امیدیں مر کر پھر زندہ ہوئیں ۔

ایسا ہونے کے لئے صرف ایک ہی شاخ عمل کافی نہیں ہے بلکہ مسلسل اور غیر منقطع کاموں کا ایک پورا سلسلہ چاہیئے - دارالعلوم ندوہ کے متعلق جو کچھ ہوا، وہ اس قسم کے کاموں کے لئے ایک عمدہ تجربہ ہے

ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس، مدراس کے جلسہ کے بعد بالکل

موقوف ہو گئے تھے، کیونکہ نہ تو کام کرنے والے تھے اور نہ لوگوں ہی کو کسی قسم کی دلچسپی باقی رہی تھی۔

مولانا شبلی نے کوشش کی کہ سالانہ جلسوں کا سلسلہ پھر شروع ہو۔

سب سے پہلے بنارس میں اس کی تحریک کی گئی اور برسوں کے بعد ندوۃ العلماء کے انعقاد کا غلغلہ ہوا۔ پھر دوسرا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تیسرا دہلی میں اور پانچواں دارالعلوم ندوہ کی نئی عمارت میں جس کی صدارت کے لیے سید رشید رضا مصر سے آئے، گو علماء ندوہ نے کہا کہ ہمیں ان کی قابلیت معلوم نہیں۔

دارالعلوم کے سنگ بنیاد نصب کرنے کا جلسہ بھی اسی سلسلے میں شامل ہے۔

ان جلسوں سے ملک میں ندوہ کی صدائیں دوبارہ بلند ہو گئیں اور اس کے متعلق عرصے کی خاموشی سے جو افسردگی پھیل رہی تھی دور ہو گئی۔

تعلیمی حالت

ندوہ کے متعلق تمام مباحث کا خلاصہ یہی عنوان ہے۔ اس کی عظمت کسی عمارت سے وابستہ نہیں، اور نہ بہت سا روپیہ مل جانا اس کو قابل قدر بنا دے سکتا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ جس قسم کی مخصوص طرز تعلیم کے ذریعہ وہ ایک خاص جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جس

بنا بریں اسے "اصلاح دینی" کی سب سے بڑی تحریک سمجھتا ہوں،
اس کے لئے کیا ہوا اور کس قدر کام کیا گیا؟

اس سلسلہ کے کسی گذشتہ نمبر میں لکھ چکا ہوں کہ اصلاح تعلیم کے بارے میں بعض خاص رائیں رکھتا ہوں، اور میں نے ابتدا سے ندوہ پر صرف اس حیثیت سے نظر ڈالنا شروع کی ہے کہ گذشتہ قرون و تغیرات اصلاح میں جس قدر تحریکیں عالم اسلامی میں پیدا ہوئیں ان سب میں ندوہ کا کیا درجہ ہے، اور جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ اصولاً اصلاح کی کس قسم میں داخل ہے؟ پس یہاں بھی اپنی خاص آرا کی بنا پر بحث نہ چھیڑوں گا بلکہ صرف اس بنا پر کہ ندوہ نے جو تعلیمی اصول قایم کیا، اس کے مطابق اس کے اندر کیا کیا کچھ ہوا اور وہ کس نے کیا؟

آخری سوال کا ایک ہی جواب یہ ہے کہ مولانا شبلی نے کیا، کیونکہ واقعہ کو کیسے جھٹلایا جائے اور حقیقت سے کیونکر انکار کیا جائے؟

وہ جب دارالعلوم میں آئے تو اس کی بربادیاں صرف مالی اور مادی حیثیت ہی سے نہ تھیں، بلکہ سب سے زیادہ مصیبت انگیز حالت یہ تھی کہ وہ اپنی تعلیم و اصول تعلیم کی معنوی روح سے بھی یکسر محروم تھا، اور باوجود ادعائے اصلاح نصاب و غلغلۂ تجدید تعلیم، اس کی حالت ان مدارس پر کچھ بھی مزیت نہیں رکھتی تھی جو زیادہ وسیع پیمانے پر ملک میں پیشتر سے موجود ہیں، اور اس سے زیادہ وسیع جماعت کو تعلیم دے رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء نے اپنے تعلیمی کاموں کے لئے اصولاً تین نئی صلاحوں کا دعویٰ کیا تھا۔

(۱) موجودہ طریق مدارس و حسن تقسیم و نظم دارادہ کے ساتھ ایک مدرسۂ عربیہ قایم کرنا۔

(۲) درس نظامیہ جو آج کل تمام مدارس ہند میں علوم عربیہ کا نصاب تعلیم ہے، اس کی اصلاح کرنا اور ایک نیا مکمل نصاب داخل کرنا، جو مقتضیات عصریہ اور احتیاجات حالیہ کے مطابق، علوم اسلامیہ صحیحہ پر حاوی، غیر ضروری کتابوں اور قدیم طریق حواشی و شروح سے پاک، اور علوم شرعیہ میں باحسن نہج و باکمل طرق رسوخ و کمال پیدا کرنے والا ہو۔

(۳) بعض علوم عصریہ کی شمولیت اور انگریزی زبان کی تعلیم تاکہ انگریزی داں علماء پیدا ہو سکیں۔

لیکن اس وقت تک ان تینوں چیزوں میں سے ایک شے بھی دارالعلوم میں نہ تھی۔ اول تو نیا نصاب دو تین سال تک داخل مدرسہ ہی نہ ہو سکا۔ پھر انگریزی زبان کی تعلیم کی نہایت مخالفت کی گئی۔ اس کے بعد بمشکل گوارہ کیا بھی تو اس طرح کہ صرف پندرہ روپیہ تنخواہ کا ایک مدرس انگریزی کے لئے رکھا گیا جس سے دو چار لڑکوں نے اے بی سی شروع کر دی۔ فن ادب کی باقاعدہ جدید تعلیم بالکل نہ تھی۔ مضمون نگاری اور تقریر و خطابت کا کوئی سامان نہ تھا۔ طلبا میں بہت سی ذہین طبیعتیں موجود تھیں لیکن برباد ہو رہی تھیں۔ یہ تمام باتیں اشخاص پر

موقوف ہیں۔ دارالعلوم میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان باتوں کو محسوس کرے۔ کرنا اور کرنے کی قابلیت تو بڑی چیز ہے۔

ادب وتفسیر

مولانا شبلی نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا اور اس نصاب کی تعلیم شروع کی جو مدراس کے اجلاس میں منظور ہوا تھا۔ فن ادب ہماری قدیم تعلیم کی حقیقی روح ہے، اور قرآن وحدیث کے خزائن وعلوم اسی کے اندر مدفون ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ابتدا سے یہ فن مہجور رہا اور درس نظامیہ کو تو گویا اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ مولانا نے فن ادب کے لئے خاص طور پر کوشش کی اور صحت تعلیم فن، وحصول مناسبت تام، و درس کتب قدماء بیان وبلاغت کے ساتھ صحیح وفصیح عربی میں تقریر وتحریر کا بھی طلبار کے لئے سامان کیا۔ یہ فی الحقیقت ہندوستان کے تمام مدارس عربیہ کے تعلیم ادب میں سب سے پہلی بدعت حسنہ تھی چنانچہ چند سالوں کے اندر ہی اس کے نتائج ظاہر ہوئے متعدد متعلمین ندوہ کو عربی میں تقریر وتحریر کی ایسی قابلیت پیدا ہوگئی کہ انھوں نے سالانہ مجامع میں فی البدیہہ و برجستہ عربی میں تقریریں کیں!

اس بوالعجبی پر ہمیشہ ماتم کیا جائے گا کہ تمام علوم اسلامیہ کے درس وتدریس کا اصل مقصود قرآن تھا، اور سب کے سب اس کے لئے بمنزلہ آلات و وسائل کے تھے، مگر اجرام سماویہ کا مطالعہ کرنے والا دوربین کے بنانے میں ایسا غرق ہوگیا کہ اسے آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی

مہلت ہی نہ ملی! یعنی معقولات اور فلسفہ، کلام اصل مقصود بن گئے، اور قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ پھر یہ حالت یہاں تک بڑھی کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصود کیا ہے؟ ارسطو اور اس کے بہت دور کے کج فہم ترجمانوں کی پرستش، یا قرآن حکیم و حدیث نبوی کا فہم و درس!

بعض حامیان نصاب قدیم یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہمارا مقصود ہر علم وفن میں بذریعہ مختصرات ومطولات قوم اس درجہ مناسبت پیدا کرا دینا ہے کہ متعلم آگے چل کر خود اپنے درس و مطالعہ کے لیے راہ پیدا کرلے۔

یہ سچ ہے۔ دنیا کی ہر زبان کا نصاب تعلیم یہی مقصد رکھتا ہے یہ کچھ آپ ہی کا مقصود نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہی مقصود تھا تو اس کی کیا علت ہے کہ معقولات قدیم کے لئے تو متون وشروح کے بوجھ سے دماغوں کو کچل ڈالا جاتا ہے۔ مگر قرآن وعلوم قرآن کے لئے صرف جلالین وبیضاوی کے چند اجزاہی کافی سمجھ لئے گئے ہیں! اور پھر کیا ان کتابوں کے ذریعہ قرآن اور علوم ومعارف قرآن سے کوئی حقیقی مناسبت پیدا ہو سکتی ہے؟

بہر حال دار العلوم ندوہ میں فن ادب کی اصلاح کے بعد سب سے زیادہ زور فن تفسیر پر دیا گیا۔ طریق تعلیم میں املا (لیکچرز) کا سلسلہ شروع کیا، قرآن کریم کے مطالب کے مختلف حصے کر کے ہر ہر حصہ پر مستقل

درس دینے کی کوشش کی، اور گو سب سے بڑی لاعلاج مصیبت اشخاص و معلمین کے فقدان کی تھی، تاہم بہت سی مشکلوں سے راہ صاف ہوئی اور تفصیل مفصل صحبتوں کی محتاج ہے۔

درجۂ تکمیل

علوم اسلامیہ کی موجودہ تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ فن تعلیم کے ان عمدہ اصولوں سے جو آج انسانی دماغ کی مخفی قوتوں کو ابھار رہے، اور قدرتی قابلیتوں کی نشو و نما کر رہے ہیں، اسے کوئی مناسبت نہیں۔ تعلیم کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے طلبا کو تمام ضروری علوم سے بقدر ضرورت آشنا کیا جائے، اور گویا اس طرح ان کے دماغ کے آگے علم و فن کی تمام جنس و متاع رکھ دی جائے۔ پھر دیکھے کہ قدرتی طور پر کس طالب علم کو کس چیز سے ذوق خاص ہے؟ اور کون دماغ کس شاخ علم کے لئے اپنے اندر مناسبت طبیعی رکھتا ہے، جس علم سے جس متعلم کو ذوق خاص ہو، اسی کی تکمیل کا اس کے لئے سامان کرے۔ کیونکہ ہر دماغ قدرتاً ایک ہی فن کے لئے مستعد ہوتا ہے اور ایسے افراد خال خال ہوتے ہیں جو متعدد علوم سے یکساں ذوق رکھتے ہوں۔

یہ میں کچھ اسپنسر کی ایجوکیشن سے نقل نہیں کر رہا ہوں، بلکہ پانچویں صدی میں امام غزالی نے بھی یہی لکھا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں تکمیل فن خاص کا مفہوم مفقود ہے۔ طالب علم

خود اپنی مناسبت سے کسی فن میں رسوخ خاص حاصل کرے لیکن مدرسہ اس بارے میں اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں علمائے فن یکسر ناپید ہوگئے ہیں۔

مولانا شبلی نے اس نقص کو دور کیا اور دارالعلوم میں ایم اے کا درجہ" درجۂ تکمیل" کے نام سے کھولا گیا تاکہ فراغت کے بعد طلبار اپنے ذوق و مناسبت کو دیکھیں اور ادب، تفسیر، حدیث، علوم جدیدہ، زبان انگریزی جس فن کو چاہیں، دو سال تک صرف اسی کو حاصل کریں

علوم عصریہ و زبان انگریزی

ندوہ نے اپنی خصوصیات تعلیم میں ایک بڑی چیز یہ بتلائی کہ وہ علوم عصریہ و السنہ فرنگ کی تعلیم، علوم اسلامیہ کے ساتھ شامل کرے گا تاکہ اسلام و اہل اسلام کی موجودہ داعیات وضروریات کے لئے علمار جامع و ذوالیمینین پیدا ہوں۔

پنبہ را آشتی اینجا بہ شرار افتادست!

لیکن اس راہ کی دقتیں بھی کم نہ تھیں۔ انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام آسان تھا مگر عربی داں طلبار کے لئے علوم عصریہ کی تعلیم مشکل تھی۔ اول تو ہماری مشرقی زبانوں میں نئے علوم کی معتمد کتب ناپید، پھر بعض تراجم عربیہ میں بھی تو ان کے پڑھانے والے کہاں سے لائے جائیں؟

تاہم اس شاخ میں بھی کوشش بالکل رائیگاں نہ گئی۔ انگریزی

تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ادب انگریزی کی
تعلیم کے لئے ایسا نصاب تجویز کیا جس کی تدریس کے بعد متعلم کو اتنی
قابلیت حاصل ہوجائے، جتنی انٹرنس کے درجے تک یونیورسٹی سے
طالب علموں کو ہو جاتی ہے۔ حساب، جغرافیہ، اقلیدس، اور ریاضی
جن کو ہمارے علماء کے دربار علم میں بہت حقارت کے ساتھ یاد کیا
جاتا ہے اور اس لئے بہت کم انھیں وہاں تک باریابی ملتی ہے داخل
تعلیم کئے گئے۔ دروس الاولیہ وغیرہ بیروت کے بعض تراجم کو باہر کے
مخصوص اشخاص کے ذریعہ پڑھایا گیا اور اس طرح طلبائے دارالعلوم
اک گونہ نئے علوم سے بھی آشنا ہوگئے۔ کم از کم وحشت و بیگانگی
نہ رہی۔

تصنیف و تالیف

ندوہ نے جس اصلاح تعلیم کا دعوا کیا تھا۔ اس کا ایک بہت
بڑا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ اپنی درس گاہ میں ایسے وسائل و اسباب
مہیا کرتا کہ اس کے تعلیم یافتہ گروہ سے مختلف علوم و فنون میں اہل
قلم و مصنف پیدا ہوتے۔

تصنیف و تالیف کا مذاق بہت سی چیزوں کا طالب ہے
تعلیم و طرز تعلیم کے بعد علمی صحبت و مجامع، مذاکرات و مباحثات علمیہ
مطالعۂ و نظر، مشق و مزاولت اور سب سے زیادہ کسی مصنف کے
زیر نظر کام کرنے سے قدرتی قابلیتوں کو تربیت میسر آتی ہے، قدیم

مدارس میں اس کا سامان ناپید ہے۔ خود مدرسین ہی کو ذوق نہیں تا بہ دیگراں چہ رسد؟ وسعت مطالعۂ ونظر کا جب سامان ہی نہ ہو تو دماغ میں استعداد اخذ و ترتیب و بحث کیونکر کام دے؟ اسی کا نتیجہ ہے کہ صدہا متخرجین مدارس عربیہ میں دو چار صاحب نظر مصنف بھی نظر نہیں آتے۔

دارالعلوم ندوہ کی ہر چیز محض ابتدا تھی۔ نیز وہ ایک انقلابی سعی تھی جو نئے ساز و سامان سے نئے نتائج پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے ابتدائی تجربوں سے نتائج کاملہ کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم بلاخوف تغلیط کہا جا سکتا ہے کہ آٹھ دس برس کے تعلیمی دور سے جو نتائج اس بارے میں بھی اس نے پیدا کئے وہ بہت حد تک تعجب انگیز اور نہایت قیمتی ہیں؛

مولانا شبلی کے مذاق علم وتصنیف وتالیف نے قدرتی طور پر اس کا سامان مہیا کر دیا۔ ایک مصنف کا وجود خود مدرسۂ فن تصنیف ہوتا ہے۔ خاص خاص طلبا جن کے اندر اس کام سے مناسبت موجود تھی مختلف عنوانوں سے تصنیف وتالیف اور انتشار رسائل کے کام پر لگائے گئے، اور فکر و مطالعہ کی راہیں ان کے سامنے کھل گئیں۔ چنانچہ متخرجین ندوہ میں سے کئی اہل قلم ومصنف پیدا ہوئے جو مختلف حیثیتوں سے آج کل کی اہل قلم جماعت میں امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ بہترین مدارس جدیدہ بھی ان کے سے نمونے پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

بھاشا اور سنسکرت

ندوہ کا اولین مقصد اشاعت اسلام تھا۔ دارالعلوم اسی لیے قایم ہوا کہ اس کے لئے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ آج کل آریہ سماج کے نئے مذہبی حلقوں نے مسلمانان ہند کے سامنے ایک نیا حریف پیدا کر دیا ہے۔ ان سے مباحثہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے علوم و الہیات سے واقفیت ہو۔

مولانا شبلی نے چاہا کہ دارالعلوم میں ایک کلاس اس کے لئے بھی کھول دی جائے تاکہ کچھ طلبا ابھی سے اس کے لئے تیار ہونے لگیں چنانچہ ایک پنڈت خاص اسی غرض سے ملازم رکھا گیا۔ اور چند طلبا نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ عرصے تک یہ سلسلہ قایم تھا۔ مجھے معلوم نہیں پھر قایم رہا یا نہیں۔

جماعت خدام اسلام

اس سے بھی اہم تر اور نتائج کے لحاظ سے اعظم ترین خیال جو ہوا وہ یہ تھا کہ طلبائے دارالعلوم میں سے کم سن بچوں کی ایک جماعت عام طلبا سے الگ کر لی جائے۔ ان کا قیام علیحدہ ہو، ان کی تربیت خاص طور پر کی جائے، ان کے طرز معیشت میں فقر و محنت کا زیادہ خیال رہے۔ ایک خاص شخص اس طرح ان کی نگرانی کرے کہ ہر وقت انھیں کے ساتھ رہے اور شب و روز کسی وقت بھی ان سے علیحدہ نہ ہو۔ تاکہ اس گروہ سے جفاکش، ایذا دوست، مذہب پرست اور

اشاعت اسلام، اصلاح ملت کے کاموں میں اپنے تئیں فدا کر دینے والے طلبار تیار ہو سکیں۔

یہ خیال جس آسانی سے ذہنوں میں آجاتا ہے، اس قدر اس کا کرنا آسان نہیں ہے، اور اس کے لئے جو سامان مطلوب ہیں وہ خاص اور بہت کم یاب ہیں۔ تاہم مولانا شبلی نے حتی الامکان اس کی ایک ابتدائی بنیاد سی ڈال دینی چاہی اور کم سن طلبار میں سے ایسے لوگوں کو حزم و احتیاط کے ساتھ چن لیا جنھوں نے اس راہ کی تکلیفیں سننے کے بعد خود ہی ان کے جھیلنے کی خواہش کی، اور جن میں ذہانت و شرافت کے علاوہ اور جوہر بھی اوروں سے زیادہ نظر آئے۔

ان کے قیام کا انتظام مخصوص کیا گیا۔ مدرسین دار العلوم میں سے ایک معتمد ترین بزرگ کو ان کی نگرانی سپرد کی۔ تقریر، بحث کی مشق کرائی جانے لگی۔ چھوٹے چھوٹے بچے جن کی عمریں بارہ تیرہ برس سے کسی طرح زاید نہ ہوں گی، برجستہ اور رواں و مربوط تقریر کرنے لگے۔ مذہبی اعمال کی پابندی میں بھی ان کی سختی بہت زیادہ رکھی گئی۔ پانچ وقت مسجد میں وہ اولین صف کے نمازی تھے۔

میں نے یہ حالات بارہا خود دیکھے اور جب کبھی لکھنؤ گیا اُن میں سے کسی نہ کسی لڑکے کی نسبت اچھی رائے قائم کرنے کے مواقع ہاتھ آئے

یہ ایک صحیح اصول پر محض ابتدا تھی، لیکن اس کے لئے بہت سے

نایاب اجزا رعمل مطلوب ہیں

خلاصۂ مطالب

یہ ایک اجمالی نظر تھی ان واقعات پر جو ۱۹۰۶ء سے کہ ندوہ کی نئی حیات عمل کا آغاز ہے، گذشتہ سال تک ظہور میں آئے اور یہی اس کی حیات بعد الممات اور عروج بعد از زوال کی سرگذشت ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے گذشتہ کاموں کی نسبت لوگوں کو ایک مکمل و مرتب معلومات حاصل ہو جائے اور وہ اندازہ کر سکیں کہ کس قدر کام ہو چکا ہے؟ یہی سبب ہے کہ موجودہ حالات کے نقائص کا تفصیلی بیان میں نے ملتوی کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ندوہ کی غرض تاسیس اور گذشتہ کاموں کی مقدار بیان کر دی جائے۔

ایک صحیح اور مکمل واقفیت کے بعد جو رائے قایم ہوتی ہے وہی صحیح رائے ہوتی ہے۔ ندوہ اب ایسی ہی رایوں کا محتاج ہے۔

دنیا عالم اسباب ہے اور کوئی فعل وجود میں آ نہیں سکتا جب تک کہ اس کے تمام اسباب جمع نہ ہو جائیں۔ پس مولانا شبلی نے دار العلوم کے لئے یہ جو کچھ کیا، اس کی اصلی علت صرف انھیں کی کوششیں نہیں ہو سکتیں۔ یقیناً بہت سے اسباب و علل اس کے لئے فراہم ہوئے۔ لیکن اگر اس تعمیل کا مطلب یہ ہو کہ پیش نظر نتائج کو ان کی طرف منسوب نہ ہونا چاہیئے تو یہ ایک ایسی سوفسطائیت ہوگی جس کے بعد دنیا میں کوئی نسبت فعل کا رجائز نہ ہو سکے گی!

دنیا جانتی ہے کہ میں مداح نہیں بلکہ معترض ہوں۔ الحمد للہ کہ میرے اعتراف و اقرار کی گردن میرے خدائے قدوس نے بہت ہی متکبر بنائی ہے، اور مجھے انسانوں کے آگے جھکنے کا سبق نہیں ملا ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ میرے لئے انسانوں کی تعریف سے بڑھ کر کوئی بھی مکروہ و غیر مطبوع کام نہیں ہوتا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہوں بھی تو خود میرا دل مجھے ملامت کرنے لگتا ہے، اور میرا ضمیر کچھ اس طرح خود بخود محجوب ہو جاتا ہے گویا اس سے کوئی بڑا ہی شرمناک جرم سرزد ہو رہا ہے

غیور و اولالعظم عرفی نے میری زبانی کہا ہے۔

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از وظیفۂ عشقی وظیفہ ات غزل ست

لیکن با ایں ہمہ میں پورے اطمینان اور کامل راحت ضمیر کے ساتھ مولانا شبلی کی ان خدمات کا اعتراف کرتا ہوں جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے لئے انجام دیں اور تسلیم کرتا ہوں کہ ان کاموں میں ایک بڑا ہی قیمتی جوہر ایثار نفس کا تھا جو آج کل بہت کم یاب ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ندوہ جس غرض سے قائم ہوا، جس مقصد کا اس نے اعلان کیا، جو مقصد وہ کھو رہا تھا، جس کھوئے ہوئے کو اٹھانے والا اور گمنامی و فنا سے زندگی و شہرت میں لانے والا کوئی نہ تھا، اس کے لئے کس کا وجود موجب نجاح ہوا، اور کس نے اپنا وقت، اپنی

قابلیت، اپنا دماغ، صرف کر کے پورے ایثار کے ساتھ دارالعلوم ندوہ کو موت کے منہ سے نکالا، اور موجودہ حالت تک پہنچایا؟

صداقت کا اعتراف، اس کا قدرتی حق ہے، اور دماغ و عقل مجبور ہے کہ سفیدی کی سفیدی کا اقرار کرے۔ پس یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ مولانا شبلی نے کیا، اور ان کے وجود سے ندوہ کی گذشتہ ہستی کو الگ کر کے دیکھیے تو صرف گولا گنج لکھنؤ کا ایک ویرانہ باقی رہجاتا ہے، جس کے اندر تباہی و بربادی کی خاک اڑ رہی ہے!

مفاسد و فتن

یہ تصویر کا روشن رُخ تھا۔ اب اس کے تاریک رخ پر نظر ڈالیے یہاں تک تو ان کاموں کی تفصیل بیان کی گئی جو ندوہ کی تکمیل کے لئے انجام پائے، مگر اب ان مفاسد کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو ندوہ کی تخریب و ہلاکت کے لئے مختلف اسباب سے پیدا ہوئے اور جن کی اصلاح کے لئے مولانا شبلی نے اپنی پوری قوت صرف نہ کی۔ وہ خود بھی دیتے رہے اور باہر کے ان لوگوں کو بھی دباتے رہے جن کو اصلاح کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ ان کے سامنے فساد و فتن کا شجرۂ خبیثہ نشو و نما پا رہا تھا اور آنے والے وقت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ ان کا فرض تھا کہ یا تو اس کا پورا استیصال کرتے اور اگر اشتعال فتنہ و طغیان کے خوف اور اپنے کاموں میں تنہا ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے، تو کم از کم قوم کو اس سے مطلع کر دیتے تاکہ ان کی ذمہ داری باقی نہ رہتی۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اس کام کے لئے قوم کا

نہایت قیمتی اینٹ چونا فراہم کرتے رہے، جس کی نسبت انھیں علم تھا کہ اس کی بنیاد ہی یکسر کھوکھلی ہے!

علاوہ ان اصولی مفاسد کے جو ندوہ کو اس کی حقیقی روح ہی سے خالی کر دینے والے ہیں، اور بھی متفرق واقعات ایسے پیش آتے رہے جو دیانت و صداقت اور اصول و قواعد کے بالکل خلاف تھے۔ جلسۂ انتظامیہ کی مجارٹی ان کو پسند کرتی اور مولانا شبلی مخالفت کر کے پھر اپنی کمزوری سے خاموش رہ جاتے۔

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی نے ندوہ کو بالکل بربادی کے عالم میں پایا اور وہ اسے رفتہ رفتہ درست کرنا چاہتے تھے۔ نیز اصلاح کا عنصر قلیل اور مادۂ فساد و شرارت کثیر و وسیع تھا۔ تاہم یہ مفاسد ایسے تھے جن پر کسی طرح بھی چشم پوشی جائز نہیں ہو سکتی اور جب کہ خود اسی کام کے اندر یہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کے وہ خود بھی ایک رکن رکین تھے، اور جس پر صرف انھیں کی وجہ سے قوم کو اعتقاد تھا تو ایسی حالت میں ان کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ معاف فرمائیں اگر میں کہوں کہ ان پر باطل کی اعانت اور فساد پر سکوت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ وہ صرف دارالعلوم کے سیکرٹری تھے۔ ان کاموں میں شریک نہ تھے اور ان کو اندر ہی اندر روکنا بھی چاہتے تھے، مگر صحیح مسلم کی حدیث "من رای منکم منکراً" الخ کے آخری درجے "وان لم تستطع فبقلبہ" کا یہ موقع نہ تھا، اور وہ بھی "اضعف الایمان" میں داخل ہے۔

ندوہ کا قانون اساسی

افساد و فتن کی پہلی تخم ریزی ندوہ کی بنیادی چٹان، یعنی دستور العمل سے شروع ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرے سے ندوہ نے اپنا مقصد ہی کھو دیا۔

ندوۃ العلماء اصلاح دینی کی ایک تحریک تھی جو علوم اسلامیہ کے درس صحیح کے ذریعہ قوم میں مرشدین و مصلحین کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہتی تھی جس کی تعلیم و مساعی سے ارشاد و دعوت دینے کا سلسلہ حقہ قایم ہو کر تمام امراض ملت کا یہ ایک ہی علاج ہے۔

لیکن بدبختی یہ تھی کہ یہ خیال معدودے چند اشخاص کا تھا جو ندوہ کے بانی اور روح رواں تھے۔ باقی زیادہ تر ہجوم ان لوگوں کا تھا جو یا تو سرے سے "اصلاح" کے مخالف و منکر شدید تھے۔ یا ایک بھیڑ اکٹھی ہوتی دیکھ کر خود بھی شامل ہو گئے تھے مگر کچھ نہیں جانتے تھے کہ اس کا اصلی مقصد کیا ہے؟ کوئی سمجھا کہ شہرت و نمایش کا وسیلہ ہے۔ کسی نے خیال کیا کہ ارباب دستار کی مقبولیت اور مرجع خلائق بننے کا اچھا اکھاڑہ ہے۔ کوئی آیا کہ اپنی وعظ طرازی اور ترانہ سنجی کا اشتہار دے، اور کسی نے اس کے سفرۂ ضیافت کے طول و عرض کو ناپا اور بے اختیار ہو گیا۔

پس کچھ تو وہ لوگ جو اُسے بالکل نہ سمجھے، اور کچھ وہ جو اُسے سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں مگر اعتقاداً "مسئلہ اصلاح" کے سخت مخالف و [illegible] تھے [illegible] گھن کے جو درخت کی جڑ میں لگ گیا ہو، ابتدا سے

اس کے اندر رہے، اور جماعت مصلحین کی قلت و کمزوری اور زیادہ تر اس کے مرکز میں نہ رہنے کی وجہ سے متصل نشو و نما پاتے رہے۔ ان کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ ندوہ سے "اصلاح" کا عنصر نکال دیا جائے، اور جہاں تک ممکن ہو اپنی تنگ خیالی اور تقشف وجمود کے رنگ میں اسے رنگ دیا جائے۔ چنانچہ اس کو عمدہ فرصتیں ملیں اور سب سے پہلے ندوہ کے قانون اساسی (کانسٹی ٹیوشن) میں متعدد اصولی تبدیلیاں کر دی گئیں جس کی وجہ سے قوم کی نیابت اور جمہور کا اشتراک مفقود ہو گیا اور صرف چند آدمیوں کے ہاتھ میں سیاہ اور سفید کا اختیار آ گیا۔

اس کی پہلی بربادی کے بعد جب مولانا شبلی لکھنؤ میں آئے تو ان کے متعلق صرف دارالعلوم کی معتمدی کی گئی۔ ندوۃ کی مجلس انتظامیہ کے لئے کوئی سیکرٹری ہاتھ نہ آیا جو اس کی اصلی مشین کے پرزوں کا زنگ دور کرتا۔ وہ تمام تر دارالعلوم کی اصلاح و تکمیل میں مشغول رہے اور یہ عنصر فساد مجلس انتظامی میں اپنے اعمال مفسدہ برابر انجام دیتا رہا۔ وہ اگر چاہتے تو اصلاح کی قوت سے فساد کو شکست کامل دے سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ اپنے کاموں میں موانع و افساد دیکھ کر خاموش ہوتے رہے۔

وہ سمجھے کہ کسی کام کے اندر رہ کر آہستہ آہستہ اصلاح کرنے کا اصول اختیار کرنا چاہیئے حالانکہ اس کا موقع نہ تھا

تفصیل اجمال

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

ندوۃ العلماء مسلمانان ہند کی ایک عظیم الشان دینی تحریک تھی، اور وہ ایک ایسا مرکز بنانا چاہتی تھی جو ان کی تمام ضروریات و معاملات مذہبی کی کفیل ہو۔ وہ جماعتی کاموں کے اصول پر ایک قومی مجلس تھی اور قوم ہی کے سرمایہ سے اپنے تمام کاموں کو انجام دینا چاہتی تھی۔ اس بنا پر ضرور تھا کہ اس کا نظام عمل بالکل اسی طرح جمہوری اور اشتراکی اصول پر ہوتا، جیسا کہ ہر قومی انجمن کا ہونا چاہیئے، اور شخصی اقتدار اور محدود جماعتوں کے قبض و تسلط سے وہ ہمیشہ آزاد رہتی۔

اس کی شاخیں تمام ضلعوں میں قایم کی جاتیں اور ہر صوبے سے اس کے لیئے ممبر منتخب ہوتے اور جو کچھ ہوتا، جلسۂ عام میں ہوتا۔

صرف یہی نہیں کہ آج کل تمام جماعتی کاموں کا یہی اصول ہے، بلکہ در اصل شریعت حقہ اسلامیہ کا اصل الاصول "شوریٰ" یہی تعلیم دیتا ہے اور ہماری نظر غیروں کی تقلید پر نہیں بلکہ اپنے الہامی اصولوں پر ہونی چاہیئے۔

چنانچہ ندوہ جب قایم ہوا تو یہ امور اس کے پیش نظر تھے اور جو قانون اساسی بنایا گیا اس میں جماعتی کاموں کے نظام صحیح کے مطابق پوری وسعت اور جمہوریت رکھی گئی۔ اس قسم کے کاموں میں سب سے بڑا اہم مسئلہ عہدہ داروں کے تقرر اور ممبران خاص کے انتخاب کا ہوتا ہے کہ اصلی کارکن قوت وہی ہوتے ہیں۔ ندوہ کے اصلی قانون اساسی کی دفعات اس بارے میں یہ تھیں

دفعہ ۲۷ ارکان جلسۂ انتظامیہ کا انتخاب ہر سال جلسۂ عام میں

اس طرح ہوا کرے گا کہ موجودہ مجلس انتظامیہ ایک فہرست بہ پابندی قواعد دستور العمل ہذا مرتب کرکے پیش کیا کرے گی جس میں کمی بیشی اور تغیر و تبدل کا اختیار جلسہ عام کو ہوگا

دفعہ ۳۶ - ندوۃ العلماء میں ایک ناظم اعزازی (آنریری سیکرٹری) جلسہ عام سے منتخب ہوگا۔

دفعہ ۴۸ - عموماً صرف ناظم ندوۃ العلماء کی معزولی جلسہ عام سے ہو سکے گی اور دیگر عہدیداران ندوۃ العلما کی معزولی جلسہ انتظامیہ سے ہوگی۔"

ندوہ کا نظام (کانسٹی ٹیوشن) اس اصول پر تھا کہ تمام حق نظم و ادارہ اور قوت نافذہ و آمرہ ایک منتخب مجلس کو دی گئی تھی جس کا نام "مجلس انتظامیہ" رکھا گیا تھا ("مجلس انتظامیہ" ایک لغو اور مہمل ترکیب ہے۔ نہیں معلوم کس نے وضع کی)۔ یہی مجلس سب کچھ تھی اور اب تک ہے۔

پس دفعات کے ان الفاظ پر غور کیجئے جن پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔ ان دفعات سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ندوہ نے اپنی مجلس انتظامیہ اور اپنے سیکرٹری کا حق انتخاب جلسہ عام کو دیا تھا جس میں ہر حصے اور ہر طبقے کے افراد ملت جمع ہوں اور نیابتی اصول پر ممبر اور سیکرٹری منتخب کیا جائے پھر سیکرٹری کی معزولی کا حق بھی جلسہ عام کو دیا تھا کہ جو قوت کسی عہدہ دار کو نصب کر سکتی ہے، اسی کو حق عزل بھی ملنا چاہیے

یہی اسلام کا صحیح اصول شوریٰ اور نظام اجتماعی ہے اور کوئی حکومت کوئی ریاست، کوئی انجمن، کوئی جماعت کبھی اسلامی نہیں کہی جا سکتی، جب تک

کہ وہ اس اصل شرعی و دینی اور حکم مقدس الٰہی کی پیرو نہ ہو۔

لیکن بدبختانہ سب سے پہلے خنجر فساد و ضلالت نے ندوہ کی اسی شہ رگ کو زخمی کیا اور "ملک عضوض" کی بعض ارواح مفسدہ ایسی پیدا ہوگئیں جنھوں نے ندوہ کے نظام جمہوری و شرعی کو یکایک حکومت مطلقہ و شخصیہ کے نظام باطل و بدعت سے بدل دیا، اور اس طرح ندوہ کی وہ بنیادی چٹان ہی شق ہو گئی جس پر کبھی اس کی سربفلک عمارتیں کھڑی کی جاتیں۔

انھوں نے دیکھا کہ ندوہ کی اصلی قوت حاکمہ مجلس انتظامیہ ہے۔ اس کے ممبر اگر جلسۂ عام میں منتخب کیے گئے تو قوم کا ایک بڑا حصہ اس میں شامل ہو گا اور ہر حصے اور طبقے سے اشخاص لئے جائیں گے۔ پس ندوہ کی حکومت قوم کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ جس کو وہ چاہے گی سیکرٹری بنائے گی اور جس کو چاہے گی معزول کر دے گی۔ اس طرح کی حکومت راشدہ سے شخصی اقتدار و مطلق العنانہ حکمرانیوں کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ندوہ کو اپنی جائداد بنا کر کوئی نہیں رکھ سکے گا۔ پس سب سے پہلے مجلس انتظامی کے انتخاب کا حق جلسۂ عام سے غصب کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ نئے دستور العمل میں جلسہ عام کی قید اڑا دی گئی۔

اسی طرح سیکرٹری کی معزولی کا جو حق شرعی و دینی جلسۂ عام کو حاصل تھا، وہ بھی اس سے چھین لیا گیا۔ یعنی جن مسلمانوں کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما، کی معزولی کا حق حاصل تھا اور ان کے اس حق کو خود یہ جانشین پیغمبر تسلیم کرتے تھے، انھیں ندوۃ العلماء نامی ایک انجمن کے سیکرٹری کو معزول

کرنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت اس کارروائی کے بعد ندوہ ایک اسلامی انجمن ہی نہ رہا کیونکہ میں کسی جماعت کو جو اپنے اندر اسلام کے اصل الاصول شوریٰ اور اشتراک جمہور کے قاعدے کو نہ رکھتی ہو، ابداً اسلامی جماعت تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ شاید اس ملت کی پیرو ہوگی جس میں کسریٰ اور قیصر گذرے ہیں، مگر وہ اسلام جس کے پیرو ابوبکر و عمر تھے (رضی اللہ عنہما) اور جس کے قرآن میں سورۂ شوریٰ موجود ہے، اس سے انھیں کچھ تعلق نہیں۔

مجلس خاص

اس کے بعد اپنے تمام استبدادی اغراض مقسدہ کی تکمیل اور خود مختارانہ اعمال سیئہ کی تحصیل کے لئے ایک قدم ضلالت اور آگے بڑھایا اور دستور العمل میں "مجلس خاص" کے نام سے ایک مجلس کا اضافہ کیا جو فی الحقیقت اپنے خواص و اوصاف کے لحاظ سے عجائب خانہ ندوہ کا سب سے زیادہ عجیب الخلقت جانور ہے۔ شاید ہی دنیا کی کسی مجلس میں جو ایک قومی مجلس کے نام سے مشہور ہو، ایسی صریح خود مختاری اور شخصی استبداد و حکومت مطلقہ سے کام لیا گیا ہوگا جیسا کہ اس خانہ ساز مجلس کے وضع کرنے میں لیا گیا۔ وہ قطعاً عجیب الخواص ہے۔ کیونکہ جہل و فساد، دونوں کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف تو اس کو دیکھ کر ان احمقوں کی بے وقوفی پر ہنسی آتی ہے، جو ایک عظیم الشان مجلس کو چلانے اور قایم رکھنے کے وہم میں گرفتار تھے مگر انھیں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ دنیا بھر میں مجلسوں اور جماعتی کاموں کے عام اصول کیا ہیں؟ دوسری طرف

ان کے اِفساد وشرِ عظیم پر متاسف ہونا پڑتا ہے کہ کس طرح قوم کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ندوہ کے جسم سے یکسر روح حیات وعمل کھینچ لی اور پھر اس کی بے جان لاش پر گدوں کی طرح گر کر پنجے مارنے لگے۔

اس "جلسۂ خاص" کو ایک طرف تو اس قدر وسیع اختیارات دے دیے گئے کہ ندوہ کی ہستی یکسر اس کے قبضہ میں چلی گئی۔ یعنی قانون اساسی اور تمام قواعد وضوابط متعلق ندوہ کی تبدیل وترمیم بلکہ یک قلم منسوخ کر دینے کا اختیار بھی اسی کو دے دیا گیا (دیکھو دفعہ ۳۵ دستور العمل حال) دوسری طرف اس کے انعقاد کو تمام مجلسی قواعد وشرائط کی پابندی سے بالکل آزاد کر دیا تاکہ اس کے مطلق العنانہ کاموں میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے!

چنانچہ دستور العمل حال کی دفعہ ۲۹ میں ہے۔

"جلسۂ خاص کے لیے کوئی وقت اور کوئی زمانہ معین نہیں ہے۔ حسب تحریک ارکان مجلس انتظامی، یا ناظم، یا نائب ناظم، جب ضرورت پیش آئے، منعقد ہو سکتا ہے"

اصول اور حق جماعت کو شاید ہی دنیا میں اس طرح کسی نے غارت کیا ہو گا! ایک عظیم الشان قومی انجمن کے انتظام کے لیے ایک مجلس مقرر کی جاتی ہے جس کے اختیارات کا یہ عالم ہے کہ وہ اس کے کانسٹی ٹیوشن تک کو بدل ڈال سکتی ہے۔ لیکن نہ تو اس میں عام انتخاب کو دخل ہے، نہ اس کے ممبروں کی تعداد میں وسعت ہے، نہ اس کے لیے قابل اطمینان ضوابط وقواعد ہیں کوئی شرط، کوئی مہلت، کوئی زمانہ اس کے لیے معین نہیں۔ جب کبھی دو چار

انتظامی ممبروں کے نام سے ایک درخواست حاصل کرلی جا سکے یا سیکرٹری اپنی کسی خاص غرض سے ایسا کرنا چاہے، فوراً چند اشخاص کی ایک مجلس منعقد کرکے ایک حکمران وفعال مایرید کی طرح ندوہ کے تمام قوانین وضوابط کو منسوخ کردے سکتا ہے!

پھر صرف سیکرٹری ہی تک آکر معاملہ ختم نہیں ہوجاتا۔ نائب سیکرٹری بھی اگر چاہے تو دستورالعمل نے اسے پورا حق دے دیا ہے۔

شجرۂ فساد کا دوسرا تخم

یہ ظاہر ہے کہ ندوۃ العلماء کا مقصد صرف ایک عربی مدرسہ قائم کرنا نہ تھا۔ وہ ایک عظیم الشان دینی تحریک تھی جو حفظ کلمۂ اسلام کے لئے تمام علماء ملت کو متفقہ ومتحدہ جدوجہد کرنے کی دعوت دیتی تھی، اور ایک ایسا عام مذہبی مرکز بنانا چاہتی تھی جو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص نہ ہو، بلکہ وہ تمام عظیم الشان تحریکیں جو کل مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہوں اس کے اندر انجام پاسکیں یہی سبب تھا کہ اس نے ابتدا ہی سے اپنے اہم مقاصد یہ قرار دیے کہ حفظ کلمۂ توحید و خدمت اسلام کے لئے تمام علما کا اجتماع، اور اصلاح نصاب وتعلیم قدیم۔

پہلے مقصد کی بعض حلقوں سے سخت مخالفت ہوئی اور بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ بعض علماء نے رفع نزاع باہمی اور اتحاد علماء کا یہ مطلب سمجھا کہ ندوہ اسلام کے مختلف فرقوں کے عقائد کو باہم ملاکر ایک نیا معجون مرکب بنانا چاہتا ہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے ان مخصوص عقائد کو ترک کردے جنھیں وہ حق سمجھتا ہے، لیکن ندوہ نے اپنے مقصد کو

زیادہ واضح کیا کہ اس کا مقصود اختلافات باہمی سے دست بردار ہونا ہیں ہے اور نہ اس طرح کا اتحاد حق پرستی اور امر بالمعروف کے ساتھ کبھی ہو سکتا ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ جو امور تمام مختلف گروہوں اور جماعتوں کے مشترک معتقدات ہیں مثلاً حفظ بیضۂ شریعت و دفع ہجوم منکرین اسلام، واصلاح عموم مسلمین، وتبلیغ کلمۂ توحید ورسالت، ان مقاصد کے لئے تمام پیروان کلمۂ شہادت متفق ہوکر اپنی قوتوں کا ایک مشترک مرکز بنائیں۔ جدید علوم مادیہ نے آریہ سماج کے مشنریوں نے، عالم مسیحی کے عالمگیر دینی حملوں اور متواتر کوششوں نے، جو نقصان اسلام کی قوت دینی وتبلیغی کو پہنچایا ہے، اس کا اثر اسلام کے ہر فرقے پر یکساں پڑتا ہے۔ اگر کلمۂ اسلام سب کو محبوب ہے، تو اس کے لئے سب کو اپنی قوت صرف کرنی چاہئے۔

اسی طرح بہت سے مذہبی معاملات ایسے ہیں جن کا تعلق گورنمنٹ سے ہے اور ان کے لئے کسی ایک فرقے کی نہیں بلکہ عموم اہل اسلام کی طرف سے صدا بلند ہونی چاہئے۔ ندوہ صرف اس لئے قایم ہوا ہے کہ ان مشترک مقاصد کو انجام دے۔ باقی رہے ہر گروہ کے مخصوص کام، تو ان کے لئے پہلے سے مختلف انجمنیں قایم ہیں اور ہر فرقہ اپنے مخصوص اعتقادات پر پوری طرح قایم رہ کر ہر طرح کے کام انجام دے سکتا ہے۔

ندوہ کے لئے یہ اصول ابتدا سے بمنزلۂ ایک بنیاد اور اساس کے تھا اور اس کے قدیم دستورالعمل میں کوئی قید کسی خاص گروہ کے لئے نہ تھی لیکن بعد کو یہ عمومیت بالکل نکال دی گئی اور ایک دفعہ یہ بڑھا دی گئی کہ ندوہ کے

ارکان انتظامی صرف ایک ہی گروہ سے لئے جائیں گے اور اس طرح اس کا دائرہ سمٹ کر بالکل محدود ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی انجمنیں جو آج ملک میں قائم ہیں، ان کے دستور العمل میں اس سے زیادہ وسعت و عمومیت ہوگی جتنی کہ موجودہ حالت میں نظیم انشان ندوہ میں ہے!

استبداد وافساد کار کا نتیجہ

ان تغیرات مفسدہ و بدعات منکرہ سیئہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ندوۃ العلما سے روح عمل و اصلاح بالکل مفقود ہو گئی، اور جیسا کہ یہ مفسدین مفسلین چاہتے تھے وہ محض چند آدمیوں کا ایک خانہ ساز کھلونا بن کر رہ گیا۔ پبلک اس کے نام کو عزت کے کانوں سے سنتی تھی، لوگ اس کے مقاصد کو یاد کر کے اس سے حسن ظن رکھتے تھے، ارباب فکر و صلاح سمجھتے تھے کہ وہ اصلاح دینی کا تمام عالم اسلامی میں ایک ہی عملی کام ہے۔ حتیٰ کہ قسطنطنیہ کی مشیخت اسلامیہ اس کے حالات تحقیق کرتی تھی اور سید رشید رضا اپنے تمام مقاصد اصلاح کے لئے اس کو ایک اسوۂ حسنہ بتلاتا تھا، لیکن جب کہ یہ سب کچھ سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا، تو عین اسی وقت خود ندوہ کے ارباب حل و عقد کا یہ حال تھا کہ اصلاح کے نام پر تبرا بھیجتے تھے، اور ان کے نفوس مفسدہ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی گروہ اصلاح و دعوت کے عمل صالح اور اقدام صحیح کا الدالخصام دشمن نہ تھا!

قبلہ گم شد، محتسب میخانہ را آباد کن!

متضاد صورتوں اور متخالف حقیقتوں کا شاید ہی کوئی ایسا تمسخر انگیز اجتماع ہوگا جیسا کہ بدبخت ندوۃ العلمار تھا! تھوڑی دیر کے لیئے اس منظر کا تصور کرو! ایک طرف تو ندوہ کی ظاہری مصلحانہ صورت تھی، جس کی زبان پر ہر دم اصلاح اور عمل کا ورد جاری تھا۔ اس کی صدائیں قسطنطنیہ پہنچتی تھیں، اور قاہرہ کے اندر اس کی تقلید میں ایک نئی بنیاد ڈالی جارہی تھی۔ اس کے جلسے ہوتے تھے اور اس کے سب سے بڑے کام یعنی دارالعلوم کا سیکرٹری مسئلہ اصلاح تعلیم اور اجتماع نتائج قدیم و جدید پر تقریر کرتا تھا۔ لوگ سنتے تھے اور آمال اصلاح و قرب حصول نتائج کے تصور سے خوش ہوتے تھے اس کے بعد بعض ان فارغ التحصیل طلبار کی صورتیں تھیں جو دارالعلوم کے اولین دور کے نتائج قائمہ ہیں، اور جو اپنی ممتاز خصوصیات کے اندر لوگوں کے لیئے ایک دعوت جالب اور پیغام جاذب تھے۔

لیکن دوسری طرف جب ظواہر و صور کا پردہ اٹھتا تھا اور خود ندوہ کا باطن سامنے آتا تھا، تو اس کی جماعت حل و عقد اپنے تمام آلات مفسدہ اور اسلحۂ باطلہ کے ساتھ جلوہ فروش ہوتی تھی اور ان نبرد آزمایان فضیلت و تقدس میں کا ہر مجاہد فخر کرتا تھا کہ اس کی سیف غزار جہل نے "اصلاح و عمل" کی کسی نہ کسی ایک ہستی کو عین اس کی پیدایش کے وقت ضرور ہی خاک و خون میں تڑپایا ہے!!

آفتے بود ایں شکار افگن کزیں صحرا گذشت!

نسۃ شام کی نصف شب

بہت سی تاریخیں یادرکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ فرانس ۱۴ جولائی سنہ ۱۷۸۹ء کو نہیں بھولتا کہ آزادی کی رحمت کا اسی دن نزول ہوا۔ انگلستان ۲ جون سنہ ۱۶۴۹ء کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے کہ شاہی اقتدار پر آخری ضرب اسی دن لگی۔ لیکن یہ یادگاریں دنیا کی زندہ قوموں کا حصہ ہیں۔ ہم بدبختوں اور زبوں طالعوں کے پاس بھی بہت سی تاریخیں ایسی تھیں جن کی عظمت کے آگے صرف ہم ہی نہیں بلکہ تمام عالم سر جھکاتا تھا لیکن یہ زندگی کے کاروبار تھے، اب کہ موت کی مردنی سے جسم ملت کا ہر عضو افسردہ ہو رہا ہے، ایسے نصیب کہاں کہ کامیابی و فتحیابی کی تاریخیں یاد رکھنے کے لئے میسر آسکیں۔ قومی اقبال کا آفتاب جب چمکتا ہے تو شاید ایک ہی مرتبہ چمکتا ہے لیکن:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

قسام ازل نے ہر شخص کو اس کی ہمت اور صلاحیت کے مطابق

اس کا حصہ دے دیا ہے۔ کوئی سایۂ طوبیٰ میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے اور کوئی قامت یار کی جستجو میں۔

تر و طوبیٰ و ما و قامت یار

خوشی کے دن ہمیں نصیب نہیں کہ یاد رکھیں تو اپنے ایام غم کو تو بھول نہیں سکتے۔ اوروں کو اگر فصل بہار کی یاد ملی ہے تو مبارک ہو، ہم خزاں کی یادگار منایا کریں گے۔

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اگر دن پھرنے والے ہیں تو عجب نہیں کہ نوحۂ غم سے نغمۂ طرب کی لے پیدا ہو جائے۔ بہار خزاں کے بعد ہی آتی ہے اور خشک درختوں کو ہم نے سرسبز ہوتے دیکھا ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ	خدا زندگی سے موت کو اور موت سے زندگی کو پیدا کرتا ہے اور زمین پر جب موت چھا جاتی ہے تو اس کی رحمت پھر اسے زندہ کر دیتی ہے۔

۱۲ دسمبر

ہمارے اخوان وطن جب ۱۲ دسمبر کی یادگار کا جشن منائیں گے کہ اسی دن ان کی سی سالہ (تیس سالہ) جد و جہد نے حکومت کو شکست دی اور تقسیم بنگال کا نوشتۂ تقدیر (جس کی تنسیخ کو لارڈ مارلے چاند کے لئے بچوں کا مچلنا کہتے تھے) بالآخر مٹا کر چھوڑا، تو ہم بھی بیکار نہیں رہیں گے۔ وہ اگر

اپنی کامرانی کو یاد رکھیں گے تو ہم اپنی نامرادی کا مرثیہ پڑھیں گے۔ وہ اگر اس پر خوش ہوں گے کہ تیس برس تک شاہراہ مقصود پر چلتے رہے اور بالآخر منزل کو سامنے دیکھا تو ہم اپنی گمراہی و ضلالت پر سر پیٹیں گے کہ تیس برس تک غلط راہ چل کر ٹھوکریں کھاتے رہے اور بالآخر منہ کے بل گرے۔ وہ اگر اپنے رہنماؤں کو یاد رکھیں گے جنھوں نے اپنے تئیں کھو کر آج انھیں پیدا کیا، تو ہم بھی اپنے لیڈروں کو بھول نہ سکیں گے کہ اپنے اغراض و منافع کی تلاش میں پوری ملت کی ملت کو کھو دیا۔ اور سب سے آخر یہ کہ اگر ان کو خوشی ہوگی کہ جو کچھ ملا وہ اس سے زیادہ کے اہل تھے تو ہم کو بھی شکایت نہ ہوگی کہ جس ٹھوکر سے ٹھکرائے گئے اس سے بھی زیادہ کے مستحق تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے لئے خوشی کی یاد ہے اور ہمارے لئے غم کی، لیکن اگر چشم بینا اور دل عبرت پذیر ہو تو نتیجہ دونوں کا یکساں ہے۔ ان کو کامیابی ہمت دلاتی ہے تو ہم کو ناکامی غفلت سے بیدار کرتی ہے۔ ان پر حکومت کا یہ احسان ہے کہ مایوس ہونے سے بچا لیا تو ہم پر ان سے بڑھ کر احسان یہ ہے کہ سوتے میں ہوشیار کر دیا۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ (۳: ۱۱) بیشک خدا کی نشانی ہے دونوں جماعتوں میں

۳۱ جولائی ۱۹۱۱ء

عبرت کے مواقع جلد جلد میسر نہیں آتے اور غفلت کو ہمیشہ بیداری کی کروٹیں نصیب نہیں ہوتیں، اگر ایسا ہو تو دنیا کم سوئے اور زیادہ

جاگے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ہی سوتی رہتی ہے۔ لیکن شاید اب ہمارے دن جلد پھرنے والے ہیں کہ قدرت کا تازیانۂ تنبیہ جلد جلد اٹھنے لگا ہے۔ ۱۲ دسمبر کو ابھی زیادہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ۳۱ جولائی ۱۹۱۱ء کی تاریخ نمودار ہوئی۔ آنریبل سر ایچ۔ ایس بٹلر اپنے مراسلے کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"۳۱ جولائی کو میں نے آپکو اطلاع دی تھی کہ صاحب وزیر ہند یونیورسٹی کا قیام منظور فرمانے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ۔

(۱) آپ کی کمیٹی کافی سرمایہ دکھلا سکے

(۲) یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن جو آپ پیش کریں، وہ تمام و کمال گورنمنٹ ہند اور صاحب وزیر ہند کو منظور ہو۔

نیز میں نے اس مراسلے میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ آپ کی جو اسکیم صاحب وزیر ہند کے سامنے پیش ہو گی اس کی عام تفصیلات کے متعلق وہ اپنے اختیارات کامل کو محفوظ رکھتے ہیں"۔

ہم کو یہ تاریخ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے یہی وہ یادگار تاریخ ہے جس نے گویا ہمارے موجودہ دور زندگی کی سب سے بڑی جد و جہد اور ہمارے وقت اور مال کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کا فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کمیٹی نے تمام قوم کو اس سے بے خبر رکھا، اور برابر یہی چیختے رہے روپیہ لاؤ، روپیہ لاؤ۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی رکاوٹ درپیش نہیں
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ

ان میں کا ہر فرد، ہر واقف کار شخص کی طرح خوب جانتا تھا کہ ایسی

یونیورسٹی جو گورنمنٹ کے آہنی پنجے میں دبی ہوئی نہ ہونہ ملی ہے اور نہ مل سکے گی۔ اور پھر قرائن و حالات سے بڑھ کر خود صاف صاف لفظوں میں مسٹر بٹلر نے کہہ دیا تھا کہ شرط آخری یہی ہے کہ جزو کل ہمارے ہاتھ میں محفوظ رہے گا۔ باوجود اس کے پریس کیونکہ کی اشاعت تک ان میں کا ہر شخص دانستہ دس کروڑ مسلمانوں کو دھوکا دیتا رہا اور صرف اس لئے کہ افشائے راز کے بعد چاندی اور سونے کی لگاتار بارش جو ہو رہی ہے بند ہو جائے گی۔ کسی کا لب نہیں کھلا کہ "سمائے شملہ" کا "شدید القویٰ" جو وحی اس پر نازل کر رہا ہے اس کو اپنی مظلوم امت تک بھی پہنچا دے صرف ایک "نواب وقار الملک" کا سچا اور مومن قلب تھا جو ان فریب کاریوں کا متحمل نہ ہو سکا اور علی گڑھ کے علایق کی ظلمت اس کے نور ایمان پر غالب نہ آسکی۔ انھوں نے اصلیت سے جب پردہ اٹھایا تو روپیہ دینے والوں کے ہوش و حواس ذرا ٹھکانے ہوئے اور پیشانیوں کو دیکھا تو پسینے سے تر تھیں۔ لیکن اب شکوہ و شکایت کا موقع نہ تھا۔ وہ اجتماعی جوش اور قومی جذبات جو دوسری قومیں آزادی اور وطن پرستی جیسے مقاصد عالیہ کے لئے صرف کرتی ہیں ہم ایک لفظ بے معنی اور ایک سفر بے مقصد یعنی مسلم یونیورسٹی کے پیچھے ضایع کر چکے تھے اور رہزنوں سے پہلے خود رہبروں نے دل اور جیب دونوں کو لوٹ لیا تھا۔

ہیچو خرابے کہ بہ خراب نویسند

لیکن سخت اضطراب دلی کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ یاران شاطر نے

بالآخر نواب صاحب قبلہ کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا کہ اس حق گوئی کو اس کی اصلی شان میں رہنے دیتے۔ نواب صاحب کی چٹھی کے شائع ہوتے ہی (راجہ صاحب محمود آباد) "اس سخت اور تکلیف دہ موسم گرما کی دقتیں برداشت کر کے اور "عشق ازیں بسیار کردست وکند" علی گڑھ پہنچے اور پھر چند دنوں کے بعد ہی نواب صاحب قبلہ کی دوسری مراسلت اخبارات میں شایع ہوگئی!

تاہم نواب صاحب کی عظمت ہمارے دلوں میں ہے اور رہے گی ہم ان کی مجبوریوں سے بے خبر نہیں جس سرزمین، اور جن لوگوں میں رہ کر ان کو کام کرنا پڑا اس کو دیکھتے ہوئے تقسیم بنگال کی تنسیخ، مسئلہ طرابلس اٹلی کی جدہ پر گولہ باری اور نیز مسلم یونیورسٹی پر انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی قوت ایمانی کا ایک اعجاز ہے۔ ورنہ بتکدے سے اذان کی آواز بغیر اس کے ڈھائے ہوئے آج تک کسی نے سنی ہے؟

قصر یلدیز

گو تمام دنیا اب سلطان عبد الحمید کے مظالم کو تسلیم کرتی ہے لیکن ہندوستان کی مٹی عقیدت اور پرستش کے خمیر سے بنی ہے بہت سے لوگ ہیں جن کو قصر یلدیز کے جبر و شخصیت پر اب تک یقین نہیں آتا۔ ایسے لوگ چاہیں تو ہم انھیں خود ہندوستان ہی میں ایک چھوٹا سا یلدیز بتلا سکتے ہیں۔ خود مختار بادشاہوں نے اپنا لقب "مالک رقاب الامم" رکھا تھا یعنی قوموں کی گردنوں کے مالک، کہ وہ جب چاہیں گردنوں

کو جسموں سے الگ کر سکتے ہیں۔ یہ اختیار تو اب ہم نے برطانیہ کی گورنمنٹ
آف انڈیا کو دے دیا ہے، البتہ ہمارے سروں کی مالک ایک جماعت
موجود ہے جو جب چاہے بے تامل انھیں ٹھکرا سکتی ہے۔ یہ ہمارے
خود ساختہ لیڈروں کا گروہ ہے، جنھوں نے اپنے ایوان مشورہ کو
قصر یلدیز کا نمونہ بنا لیا ہے۔ اس کے دروازے بند، اور در و دیوار
خاموش ہیں۔ ان کی رعایا کا صرف یہ فرض ہے کہ چند دن کی مالگذاری اور
خراج بے چون وچرا پیش کرتی رہے اور کبھی دم نہ مارے، اگر کوئی انقلابی
خیالات کا باغی ملک میں بےچینی پیدا کرے جو فوراً "مابین ہمایونی" سے
ایک فرمان شایع کر دیا جائے کہ ابھی وقت نہیں آیا، یا یہ رموز مملکت اور
رازدارانہ اعمال ہیں جو اپنے وقت پر خود منکشف ہو جائیں گے۔

یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَخْتَارُ — خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ مختار ہے

یونیورسٹی کے معاملے میں بھی اپنی عادت مستمرہ کے مطابق ان لیڈروں
نے یہی سمجھا تھا کہ قوم نے نہ کبھی پوچھا ہے اور نہ پوچھے گی۔ روپیہ لیتے
جائیں اور وقت ٹالتے جائیں، بند کمروں میں بیٹھ کر جو کچھ کرنا ہے کر دیں گے
جب وقت آئے گا تو سمجھا دیں گے کہ فرض اطاعت اولی الامر اور
شان وفاداری کا یہی اقتضا ہے کہ جو کچھ ملے آنکھوں سے لگا کر قبول کر لو
یہی سبب ہے کہ جب کبھی کسی بندۂ خدا سے رہا نہ گیا اور اس نے چار
لفظ منہ سے نکالے تو معاً اس کی زبان بند کر دی گئی۔ بارہا پوچھا گیا
کہ آخر یونیورسٹی ہے کیا شے؟ گورنمنٹ کیونکر ایک آزاد یونیورسٹی کو

چارٹر دے سکتی ہے ؟ حق ویٹو (VETO) کے کیا معنی ہیں ؟ مگر یونیورسٹی
بھی "استوا علی العرش" کا مسئلہ تھی کہ ہمیشہ یہی جواب ملا
کیفیۃ مجہول، والاعتقاد واجب۔ اس کی حقیقت مجہول ہے مگر اس پر اعتقاد
والسوال عنہ بدعۃ۔ واجب ہے اور اس کی نسبت سوال بدعت"
لیکن سب کچھ کہہ کر آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب قوم کا قصور ہے
اور اس کی علت بھی مسلمانوں کی تمام امراض کی طرح مذہب سے روگردانی
ہے۔ اسلام نے اپنے ہر پیرو کو لیڈر بنایا ہے اور کوئی نہیں جس کو خدا
اور رسول کے سوا مسلمانوں کے کاموں پر خود مختارانہ اقتدار حاصل ہو
احتساب ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، جب خود ہم نے اپنے تئیں
غافل رکھا تو کسی دوسرے کا کیا قصور ہے ؟

نہ پیٹیں نہ ہو قتل، انصاف یہ ہے
کہ ہم خود ستم آموز قاتل ہوئے ہیں

کیا کمیٹی کو آج ہی یہ معلوم ہوا ہے کہ یونیورسٹی آزاد اور مسلم یونیورسٹی
نہ ہوگی کہ اب آگ لگانے والے آگ بجھانے والوں کے ساتھ شریک
ہو گئے ہیں ؟ تعجب ہے اگر شمہ دوڑ دوڑ کر جانے والوں کو اس کی
خبر نہ ہو جب کہ خود ہم کو گھر بیٹھے اس کی خبر تھی ہم مسلمانوں سے بمنت التجا کرتے
ہیں کہ خدا کے لئے اب وہ بیجا عقیدت اور مہلک حسن ظن سے کام نہ
لیں کہ لیڈر پرستی کی حد ہو گئی۔ ہم ان کو اپنا دل نہیں دکھا سکتے مگر اپنی سچائی
کا شاید یقین دلا سکتے ہیں (واللہ یعلم سری وعلانیتی) ہم کو کسی سے بغض

نہیں، مگر خدا کی دوستی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ یقین کریں کہ اگر نواب وقار الملک نے عین موقع پر بھانڈا نہ پھوڑ دیا ہوتا اور قوم میں تغیرات حالت نے حقوق طلبی کی جنبش پیدا نہ کر دی ہوتی تو آج ان لیڈروں میں سے ایک بھی اس موقع پر سامنے نہ آتا اور جو کچھ ۱۱ اگست کو ہوا اس کے ذکر سے ہماری تاریخ ہمیشہ خالی رہتی۔ آج تو آغا خاں بھی عدم الحاق کی مخالفت میں تار بھیجتے ہیں اور پھر اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کا اعلان کر دو، لیکن سوال یہ ہے کہ کل تک حضرت کہاں تھے؟ اس مسئلے پر تو ان کی رائے پہلے ہی ظاہر ہو چکی ہے اور وہ جو کچھ تھی کمیٹی کے صیغہ راز داری کی الماری میں موجود ہے۔ اب ان کے تار کے اعلان کی ضرورت نہ تھی۔ فضل الٰہی سے خود ان کی خدمات کی تشہیر ہو رہی ہے۔ کل کی بات ہے کہ ہم نے ان کی گاڑی کھینچی تھی ولکن شتان ما بین الیوم والامس جن عزتوں پر خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا وہ گو کتنی ہی نظر فریب ہوں مگر پائدار اور مستحکم نہیں ہوتیں۔ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ عزت خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور سچے مومنوں کے لئے)

۱۱ اگست کو لکھنؤ میں جو جلسہ ہوا تھا پہلے دن اس کے دروازے بند نہیں کئے گئے مگر جو آنکھیں تاریکی میں کام کرنے کی عادی ہوں ان کو باہر کی روشنی کب راس آسکتی ہے بالآخر دوسرے دن گو پٹ بھڑائے نہیں گئے مگر ہلکے پردے چھوڑ دئے گئے تاکہ کچھ تو تاریکی پیدا ہو جائے

دیداری نمائی و پرہیزی کنی

سب سے پہلے راجہ صاحب محمود آباد نے افتتاحی تقریر میں
اس پر بے انتہا افسوس ظاہر کیا کہ ہم نے آج تک اپنی کارروائی کو
بصیغہ راز رکھا تھا مگر اب گورنمنٹ خود اسے ظاہر کرتی ہے۔ جب
گورنمنٹ چھپانا نہیں چاہتی تو ہم کو بھی چاہیئے کہ آئندہ سے اپنے اجلاس
پبلک طور پر کریں۔"

یہ تو راجہ صاحب نے گورنمنٹ سے خوب انتقام لیا
جزاءُ سیئۃٍ سیئۃ مثلہا بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے۔

مِنَ بِالسِّنِّ وَالجُرُوْحُ قِصَاص

ہم کو افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے کمیٹی کی رازداری کی قدر نہ کی
وہ گورنمنٹ جس کی خاطر کمیٹی نے اپنی قوم تک کو چھوڑ دیا، اور اس
روپیئے کے مصرف سے ہمیشہ بے خبر رکھا جس میں معصوم لڑکیوں کے
کانوں کی بالیاں اور بچوں کی مٹھائی کے پیسے تک شامل تھے!

اس کے بعد راجہ صاحب کو بہت سی باتیں ایسی یاد آگئیں جو
اگر چند ماہ پہلے یاد آگئیں ہوتیں تو قوم کا تیس لاکھ روپیہ اور ایک ہی مرتبہ
پیدا ہونے والا جوش، اس طرح ضائع نہ جاتا۔ تاہم اب بھی غنیمت ہی
سمجھنا چاہیئے۔ واقعات نے اس ابتدائی منزل تک تو پہنچا دیا، عجب
نہیں کہ کہتے کہتے ایسے ہی الفاظ زبان پر چڑھ جائیں

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندکے اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

باوجود ایں ہمہ جوش و خروش، پھر بھی اس جلسے کو دیکھئے تو یہ کچھ ہو چکنے کے بعد بھی ارباب طریقت اسی فکر میں تھے کہ کعبے کی طرف رُخ کرنا پڑا ہے تو کم از کم بتکدے کی طرف پیٹھ تو نہ ہو۔ پہلے بحث ہوئی کہ اس مجلس کی کارروائی بھی صیغہ راز میں رکھی جائے یا نہیں؟ گو راجہ صاحب گورنمنٹ کی اتباع سنت کے خیال سے پبلک جلسے کا اعلان کر چکے تھے اور اب بھی طبیعتیں ایک حد تک جوش و خروش کی نمایش کرنا چاہتی تھیں، لیکن مدتوں تک جو پاؤں کیچڑ میں پھنسے رہے ہوں، وہ یکایک صاف قالین پر چلیں گے تو دھبے پڑیں گے ہی۔ بعض صاحبوں نے کہا کہ گورنمنٹ نے سرِ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہو مگر ہم شایقین راہ وفاداری کو کہ پیمان محبت باندھ چکے ہیں، اب بھی مرغ سحر کی جگہ پروانے کے مشرب عشق پر کار بند رہنا چاہیئے۔

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ہم نے سنا ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی بھی یہی رائے تھی۔

ہم اس موقع پر آنریبل مسٹر مظہر الحق کی تعریف کرنے کے لئے اپنے اندر بے اختیارانہ جوش پاتے ہیں کہ انھوں نے فی الحقیقت اس جلسے کی شرم رکھ لی، اور پوری آزادی اور دلیری کے ساتھ اصول رازداری کی

مخالفت کی۔

جزاہ اللہ عنی وعن سائر المسلمین خیر الجزاء

دوسرے دن کے اجلاس میں بھی ان کی تقریر پڑھ کر ہم کو نہایت خوشی ہوئی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے مسلمانوں کی غلامانہ پالیسی کا نتیجہ ہے لیکن ناظرین اس سے یہ رائے قایم نہ کریں کہ اب ان کی پولٹیکل جماعتوں میں بھی ایسی آزادانہ رائے رکھنے والے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب پیدا ہوں، لیکن مسٹر مظہر الحق کی آزادی تو صرف اس کا نتیجہ ہے کہ وہ عمر بھر ملک کی اصلی کارکن جماعت یعنی کانگریس کے ساتھ رہے اور کبھی مسلمانوں کے پولٹیکل مذہب کی تلقینات قبول نہیں کیں۔ اگر علیگڈھ کی دلدل میں بھی وہ پھنس گئے ہوتے تو آج ان کی زبان اس طرح نہ چلتی۔ انسوس:

کاش اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

جلسہ پر ایک اجمالی نظر

لیکن بہر حال ۱۱ اگست کا جلسہ بحیثیت مجموعی ہماری انقلاب حالت کے لئے ضرور ایک پیغام امید تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے ایک پبلک مجلس میں آزادی کے ساتھ اپنی خواہشوں پر استقامت ظاہر کی، اور جوش بزدلی پر غالب رہا۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تقریر اس امر کا

ثبوت بین تھی کہ اگر قوم کے عوام اپنے اندر حرکت پیدا کر لیں تو بڑے آدمیوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلنا ہی پڑے گا۔ انھوں نے جس صفائی اور غیر مشتبہ لہجے میں موجودہ حالت کی تصویر کھینچی اور ان خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے گورنمنٹ کے تعلقات کو جیسی بے پرواہی کی نظر سے دیکھا اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے اور وہ آیندہ کے لئے ایک فال نیک ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ علاوہ اور باتوں کے ذاتی طور پر بھی خود ان کے تعلقات سر ایچ ایس بٹلر سے بہت گہرے ہیں اور اس طرح کے ہیں کہ ان سے کسی حالت میں اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں گورنمنٹ اور قوم کی صدائیں، یہ دو حریف مقابل ان کے سامنے تھے۔ انھوں نے قوم کا ساتھ دیا اور ایسی مخدوش حیثیت آج کل کے نمایاں کارفرماؤں کی سطح بہت سے بہت بلند ہے۔ انریبل مسٹر مظہر الحق اور مسٹر محمد علی کی تقریروں کو جلسہ کی اصلی کارروائی یقین کرتے ہیں۔ میاں محمد شفیع خان بہادر نے جو کچھ کہا توقع کے خلاف، مگر جونپور کے نواب عبدالمجید نے توقع سے کم کہا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی رائے تھی کہ جلسہ کی تمام تقریریں اب بھی نزداری میں رکھی جائیں نیز وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ کاش وہ بتلائیں کہ اس میں کیا مصلحت تھی؟

اصل مبحث

اب ہم چاہتے ہیں کہ اصل مبحث یعنی مجوزہ یونیورسٹی کی نسبت بھی کچھ اپنے دیرینہ خیالات ظاہر کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے مجبوراً ایک مرتبہ

گذشتہ حالات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ ناظرین طول بیان سے نہ گھبرائیں کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ ہم اپنے خیالات کو ان کے سامنے کر دینا چاہتے ہیں

قوم میں حرکت ہمیشہ پیدا نہیں ہوتی، اور دریا میں ہر روز طوفان نہیں آتے۔ یونیورسٹی کے لئے تمام ہندوستان میں جو عام صحیح جوش پیدا ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی اور ہماری روزمرہ کی افسردہ زندگی کا ایک مستثنیٰ واقعہ تھا۔ یہ کس کو امید تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی دن ایسی جنبش بھی پیدا ہو گی؟ لیکن یہ خیال کس درجہ درد انگیز ہے کہ اتنا قیمتی جوش محض ایک وجود بے روح اور لفظ بے معنی کے پیچھے غارت کر دیا گیا۔ اور قومی حرکت کی بہترین فرصت جو نہیں معلوم پھر کتنے دنوں کے بعد ہاتھ آئے بھی یا نہیں بیکار ضائع ہو گئی

اور قومیں جس جوش سے ملکی آزادی وحریت جیسے عظیم الشان مقاصد کا کام لیتی ہیں آپ نے اس سے اور زیادہ اسیر و غلامی کی زنجیریں بھاری کر دینے کا کام لینا چاہا اور قوموں کے رہنما جماعتوں کو بیدار کرتے ہیں تاکہ اٹھ کر چلیں، آپ نے ہمیں بیٹھے سے اٹھایا تاکہ اور سلا دیں۔

آج تک مسلمانوں میں کوئی بھی تحریک ایسی پیدا ہوئی ہے جو شہروں سے لے کر قصبوں اور دیہاتوں تک پھیل جائے؟

جس کا ولولہ ان پڑھ دہقانوں اور جاہل دیہاتیوں تک کے دلوں میں پیدا ہو جائے، ہر گھر میں اس کا چرچا ہو اور ہر جگہ اس کا جوش وخروش

کوئی طبقہ اور کوئی فرقہ اس سے خالی نہ ہو، منبروں پر اس کے لئے وعظ کہا جائے اور خانقاہوں میں اس کے ذکر پر حال وقال ہو۔ پرانے خیال کے دنیا سے بے خبر حلقے جو یونیورسٹی کے لفظ کا صحیح تلفظ تک نہیں کرسکتے دیہاتوں اور قصبوں میں مولود اور وعظ کے لئے چندا کرکے روپیہ جمع کریں اور پھر اسی روپیہ کو مولود کی جگہ یونیورسٹی فنڈ میں بھیجدیں۔ یونیورسٹی کا قافلہ جہاں جہاں سے گذرے، لوگ جوش ونشاط سے بیخود ہوکر اس طرح قدم لینے کو دوڑیں، گویا ملائے اعلیٰ اور قدوسیان عالم بالا عرش الہٰی کو چھوڑ کر دنیا میں اتر آئے ہیں تاکہ اپنے پروں کے سایۂ نورانی میں لے کر مسلمانوں کو پھر دونوں جہاں کی بادشاہت بخشدیں۔ ابھی نہ ملنی والی یونیورسٹی ملی بھی نہ تھی لیکن کروڑوں انسان اس طرح خوش ہو ہو کر لوٹتے تھے گویا ہندوستان کی سلف گورنمنٹ کے (میگنا چارٹر) پر شہنشاہ انگلستان کے دستخط ہو گئے ہیں یا ترکی میں پارلیمنٹ کے قایم ہونے کا پہلا روز مسرت طلوع ہوا ہے!

ہم روسکتے ہیں مگر اپنے آنسو ہر شخص کو دکھا نہیں سکتے۔ جب سوچتے ہیں کہ بدبخت ملت کا اس درجہ قیمتی جوش کس بے دردی سے ضائع کردیا گیا تو "وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ" (وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ) کہ ہمارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور حیران رہ جاتے ہیں کہ رہنمایان ملت کی اس غلط روی کی نسبت کیا کہیں؟ ہمارے ہمدرد ناصح نصیحت کرتے ہیں کہ نرمی اختیار کرو لیکن انھیں ہمارے دل کی سوزش کیا معلوم؟ یا تو ہماری آنکھ ہم کو دھوکہ دیتی ہے اور یا پھر صاحبان بصیرت دنیا میں ناپید ہو گئے۔

بنیادی گمراہی

لیکن مسجد کی محراب کا مینار اگر سیدھا نہیں تو پہلے اس کی بنیاد کو دیکھنا چاہیئے۔ افسوس کہ ہمیں یونیورسٹی کا معاملہ پیش آجانے کی وجہ سے مہلت نہ ملی اور مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی پر ابتدا سے سلسلہ وار بحث کرنے کی جگہ ایک درمیانی باب شروع کر دینا پڑا۔ یہاں مختصر اشاروں سے کام لیں گے

درحقیقت مسلمانوں کی گمراہیوں کی ابتدا اسی وقت سے ہے جب انھوں نے چلنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ بنیادی غلطی یہ تھی کہ اپنے تمام کاموں کے لئے گورنمنٹ پر اعتماد رکھنے کا راستہ اختیار کیا اور بغیر اس کے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی۔ جب مرغ دام میں آنے کے لیے مضطرب ہو تو صیاد کیوں غفلت کرے؟ اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ابتدا سے لے کر آخر تک محض ایک کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ جس کی ڈوریں پردے کے اندر تھیں اور نچانے والا اپنی بازی گری کے مصالح کے مطابق جس طرح چاہتا تھا ان کو نچاتا تھا۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ بالکل ایک نئے قسم کی دقتوں کو اپنے سامنے پاتی تھی۔ ایک طرف وہ "لارڈ مکالے" کی تعلیم دینے سے انکار نہیں کر سکتی تھی، دوسری طرف تعلیم کے قدرتی نتائج اس کے سامنے تھے ملک ابھی حکومت کے خراب کو بھولا نہ تھا، اور آگ بجھ چکی تھی، مگر چنگاریوں کے بھڑکنے کا ہر وقت خوف تھا، ایسی حالت میں وہ یہاں کے باشندوں میں سے کسی ایک عنصر کی اعانت کی ضرور محتاج تھی جو اپنے ملکی فوائد کو اس کی

حکومت کے فوائد پر قربان کر دے۔ مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے اپنے تئیں پیش کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ اڑ گئے کہ ہم کو اس قربانی سے محروم نہ رکھا جائے۔ یہ مسلمانوں کے (ذبیح اللہ) کی قربانی تو تھی نہیں کہ:

آمد بزیر تیغ و شہیدش نمی کنند

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ہندوستان میں تمام حقیقی ترقیات کے لیے ایک سخت روک، اور درمیان راہ کا پتھر بن کر رہ گئے اور از سر تا پا ان کا وجود ملک کے لئے ایک بدنصیبی ہو گیا۔ گورنمنٹ کو اپنے ملکی مصالح کے لئے جب کسی آلۂ عمل کی ضرورت ہوتی، وہ ان کے وجود کو ایک پتھر کی چٹان کی طرح ہاتھوں میں اٹھا لیتی اور ملکی خواہشوں کے شیشے پر پٹک مارتی۔

سب سے پہلے یہ ہوا کہ ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت یعنی ہندوؤں سے مسلمان الگ ہو گئے اور اس طرح عرصے تک کے لئے ملکی مطالبات کی فتحیابی سے گورنمنٹ مطمئن ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت تھی کہ ان کو بیکار نہیں رہنا چاہیے، ورنہ بیکاری سے اکتا کر راستے کی تلاش میں ضرور نکلیں گے۔ کوئی مشغلہ ایسا ہونا چاہیے جو عرصے تک ان کو اپنے میں الجھائے رکھے اور اصلی کاموں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دے تعلیم کو مسلمان پہلے سے لئے بیٹھے تھے (اور یہ خیال فی نفسہ غلط نہ تھا) اس لئے اسی اعلیٰ تعلیم کے بال و پر کو پھیلا کر ایک ایسا القسطیلی کا عجیب الخلقت پرند بنا دیا جو اپنے پروں کو کھول دے، تو سورج کو زمین کی طرف جھانکنے کے لئے کوئی سوراخ نہ ملے۔ مسلمانوں نے اس عجیب و غریب مرکب کو

مذاق سمجھا، اور یقین کر لیا کہ ہمارے سفرِ معراج کے لیے آسمانی سواری اتری ہے۔ چالیس برس گزر گئے مگر اب تک اس مرکب کی لگام ویسی ہی ڈھیلی ہے جیسی پہلے دن تھی اور منزل لامکانی کا پتہ نہیں۔ قوم کی وہ قوتیں جو یقیناً زمانے کے قدرتی اثرات سے متاثر ہو کر ملکی تحریکوں میں صرف ہوتیں، تمام تر صرف ایک اعلیٰ تعلیم کے شور و واویلا کے پیچھے مٹا دی گئیں اور جب کہ ہم سے ایک دیوار کے فاصلہ پر ملک کی جائز آزادی، ملکی حقوق کے مطالبات، اعلیٰ قوانین کی تنسیخ و ترمیم، ملکی نظم و نسق کے مباحث و افکار کی سرگرمیوں میں ہمسایوں کے جذبات و امیال صرف ہو رہے تھے، ہم اپنی کانفرنسوں، اپنے بڑے بڑے مجمعوں، اپنی شاندار تقریروں، اپنے قومی اخباروں کے صفحوں کے اندر صرف ایک افسانۂ تعلیم کی سرد لاش اٹھائے ہوئے پھر رہے تھے۔

ہمارے جذبات کے اشتعال کے لیے اگر کوئی تحریک تھی تو یہی تھی۔ ایثار و ملت پرستی کی دعوت کا پیام تھا تو اسی دسترخوان پر۔ جوش و ہنگامے کا ظہور تھا تو صرف اسی کے لیے۔ قوتِ تقریر کی نمود و نمو تھی تو اسی افسانے کے دہرانے کے لیے۔ قومیں اگر وطن پرستی کے نشے میں چور تھیں تو ہم تعلیم کے خمار میں انگڑائیاں لیتے تھے۔ ہمسایے اگر ملکی آزادی کے آفتاب کے نیچے کھڑے تھے، تو ہمارے سر اور چہرے تعلیم کی شبنم سے بھیگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اگر خود فروشی و قربانی کے انگارے تھے، تو ہم تعلیم کی سرخ گولیوں سے کھیل رہے تھے۔ ساری

دنیا اس تعلیم کے اندر تھی۔ یہی اعلیٰ پالیٹکس تھا۔ اسی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں انگلستان نے اسی کے برتے پر پارلیمنٹ لی۔ فرانس میں جو لوگ راستوں میں آزادی کا گیت گاتے ہوئے پھرتے تھے، وہ اعلیٰ تعلیم کی سندیں اپنے سینوں پر لگائے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی تعلیم ہی نے انقلاب کرایا۔ ٹرکی تو جب یورپ کے تمام مدارج طے کر چکی اس وقت عبدالحمید نے یلدیز میں بلا کر خود پیار و محبت سے کہہ دیا کہ اب پارلیمنٹ لے لو۔ پس ہندوستان میں بھی ہم کو یہی کرنا چاہیئے!

گمراہی کا دوسرا مشغلہ

اعلیٰ تعلیم کی گرہ سلجھانے میں ہم نے چالیس برس سے زیادہ صرف کر دیئے اور یہ ایک ایسا مشغلہ ہمارے لئے رہا جس نے کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کی مہلت نہ دی، لیکن انسان جو سونے اور جاگنے، دونوں کے لئے بنایا گیا ہے ممکن نہیں کہ سوتا ہی رہے۔ چالیس برس کے مرض النوم کے بعد اب خود بخود طبیعتیں کروٹیں لینے لگیں، سامنے کے رات دن کے منظر سے کہاں تک آنکھیں بند رہتیں۔ بالآخر تعلیم کے افسانے کی خراب آور قوت گھٹنے لگی، ہندوستانی دماغ اب اس مشغلے سے اکتا گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ ہندوستان کے آنسو پونچھنے کے لئے رفارم اسکیم کا رومال جیب سے نکال رہی تھی اور ملک میں ایک نیا انقلاب ہونے والا تھا۔ اس وقت ممکن تھا کہ مسلمان چالیس برس سونے کے بعد ہشیاری کی آنکھیں کھول دیتے اور ہندوستان کی مستقبل جاگنے والی قوم، ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جاتے کیونکہ ہم نے مشغلۂ تعلیم میں اب

زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور پولیٹکل کاموں کا اسٹیج ملک بھر میں صرف ایک کانگریس ہی تھا۔ پس ضرور ہوا کہ اب تبدیل ذائقہ کے لئے کوئی نیا کھلونا ہماری گود میں ڈال دیا جائے اور کچھ دنوں اس کے ساتھ کھیلنے میں کاٹ دیں یہ کھلونا ہماری نئی ضلالت یا غفلت بیداری نما "مسلم لیگ" تھا، جو زمانے کے نئے تغیرات کا لحاظ کر کے پالیٹکس کے نام سے تشکل پذیر ہوا اور اس کی ابتدا یوں کرائی گئی کہ ہم ایک نئے لیڈر کی رہنمائی میں ڈیپوٹیشن لے کر شملہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مومن چلا ہے کعبے کو ایک پارسا کے ساتھ

مسلم لیگ

اگر اب زمانے نے پلٹا کھایا ہے اور تم پالیٹکس میں آنا ہی چاہتے ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو سونے کی اشرفی ہی دی جائے؟ تمہارے بہلانے کے لئے پیتل کا ایک ٹکڑا بھی بہت ہے۔ تم ہر چمکیلی چیز کو سونا سمجھنے کے لئے تیار ہو تو تم کو سونا کیوں دیا جائے؟ اب مسلمانوں کو کھیلنے کے لئے ایک دوسرا کھلونا مل گیا اور زمانے کے تغیرات، قدیم افسانے کی بے مزگی اور تعلیم کے نتائج نے طبیعتوں میں جو حرکت پیدا کی تھی اس کو گردش کے لئے باہر جانا نہ پڑا، خود اپنے گھر کے اندر اسی نام کا ایک دائرہ مل گیا۔

افسوس کہ ہم مدتوں کی غفلت کے بعد پالیٹکس میں آئے بھی تو اپنی قوت اور دین کی امنگ سے نہیں، بلکہ

آنہم بسعی غمزۂ مردم شکار دوست

نئے پالیٹکس کی تعلیم

گو (مسلم لیگ) کا قیام کسی پولیٹکل بیداری و تلاش کا نتیجہ نہیں تھا، اور کوئی ملکی یا ملی قوت اس کے اندر نہ تھی، لیکن تاہم پالیٹکس کی حرمت کا فتویٰ منسوخ ہو چکا تھا اور کم از کم جمود میں ایک حرکت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کو اگر کوئی ہاتھ پکڑ کر باغ میں پہنچا دے تب بھی آپ اسی طرح پھولوں کی بو باس لے سکتے اور پھولوں کو توڑ سکتے ہیں، جیسے وہ شخص جو خود اپنی خواہش سے چل کر پھولوں کے عشق میں آیا ہو۔ اصل شے باغ میں پہنچنا ہے۔ اگر مسلمان لیڈر قوم کو چھوڑ دیتے تو عجب نہیں کہ یہی کھیلنے کا پتلا زندوں کی طرح حرکت کرنے لگتا مگر جس مرکب کی لگام خود اپنے ہاتھوں میں نہ ہو اس کی نسبت یہ سوچنا لاحاصل ہے کہ کس طرف لے گیا؟ یہ کیسی بدبختی کی بات ہے کہ پالیٹکس میں آنیکے بعد بھی ہم کو پالیٹکس کی لذت چکھنی ایک دن کے لئے نصیب نہ ہوئی۔ پالیٹکس میں آنے کے بعد اولین شئے ملکی حقوق کا مطالبہ اور حکومت میں اپنا حصہ لینے کا سوال تھا۔ ہم اس راہ کے کنارے ضرور آ گئے تھے۔ لیکن کارفرماؤں کی یہ عیاری عقلوں کو حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ معاً اس خوبی کے ساتھ وہاں سے ہٹا دئے گئے۔ کہ خود ہم کو تو ہٹنے کا حس تک نہ ہوا مگر شاہراہ مقصود اور ہم میں ایک ناپیداکنار اقیانوس حائل ہو گیا۔ ہم کو سمجھایا گیا کہ آج سے تیس برس پہلے جو اسباب پالیٹکس سے علیحدہ رہنے کے تھے، آج پالیٹکس میں آنے کے بعد بھی بدستور قائم ہیں۔ اس سبق کہنہ کو پھر دہرا لو! تعلیم کی کمی، تعداد کی قلت، مجارٹی کا فشار، عناصر کی مسابقت، ان تمام دائمی اور ابدی موانع میں سے

کون سی چیز دور ہوگئی ہے ؟ اس لیے اگر ملکی حقوق کے میدان میں آؤ گے تو ہمسایہ قومیں تم سے بازی لے جائیں گی پس تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے اپنے حقوق ہندوؤں کے مقابلے میں تو حاصل کر لو۔ انھوں نے اپنے غلبہ تعداد و تعلیم سے تمہاری ترقی کی راہیں تم پر بند کر دی ہیں اور تمہارے قومی حقوق چھین کر غصب کر لیے ہیں۔ اصلی پالیٹکس یہی ہے کہ ان راہوں کو ہمسایوں کے حملوں سے محفوظ کر لو، جو حقوق حکومت سے مل چکے ہیں ابھی وہی تم کو نصیب نہیں ہوئے نئے حقوق کے مطالبات کا کیا موقع ہے ؟ یہ دار و ئے بے ہوشی کا ایک نیا چمچہ تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ حقوق طلبی کی جس طاقت کا نشانہ گورنمنٹ ہوتی نہایت آسانی کے ساتھ اس کا رخ ہمسایوں کی طرف پھیر دیا گیا، اور اس طرح ایک پوری قوم کے پالیٹکس میں آجانے کے بعد بھی اس کی پولٹکل بیداری سے گورنمنٹ کے لئے کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔

ہمارا تخاطب صرف ان تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ہے جو الحمدللہ اب اپنی حالت محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ خدا کے لئے انصاف کریں کہ یہ کیسی شدید غلطی تھی اور کیسی درد انگیز حالت تھی ؟ جب کہ ہمارے ہمسائے ملکی فلاح و بہبود کی تدبیروں میں مصروف تھے، ہماری آنکھیں تمام ملک کی طرف سے بند تھیں۔ ہمارے ایک کروڑ بھائیوں کو اگر صرف ایک ہی وقت کا کھانا میسر آتا تھا، اگر تمام ملک کے افلاس کے روبہ ترقی مرض سے زار و نزار ہو رہا تھا، اگر ٹیکس کا بوجھ اس کی قوت برداشت سے بڑھا ہوا، اور زیادہ بڑھ رہا تھا، اگر زمینداروں کے مصائب سے ملک کا قلب ضعیف ہو گیا تھا، اگر

مظلوم کاشتکار موت وہلاکت کا شکار ہو رہے تھے، اگر فوجی مصارف کے بوجھ سے ملکی خزانے کی کمر ٹوٹ گئی تھی، اگر ہمارے سالانہ بجٹ میں ہماری تعلیم کے لئے کوئی امید افزا جواب نہ تھا، اگر ملکی انتظام کے تمام بڑے دروازے ہمارے لئے بند تھے، اگر ریلوے ترسیع کے ٹھیکے انگلستان کو مل رہے تھے اور ملک آبپاشی کے بغیر جاں بلب تھا اور اگر قانون ناقص اور انتظام راحت بخش نہ تھا تو ان تمام چیزوں کے لئے ہمیں باوجود ہندوستان میں رہنے کے دردسر اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ جھگڑے صرف ہندوؤں کے لئے تھے، اور ان میں پڑنا خدا کا جرم وعصیاں اور حکومت سے بغاوت تھا، صرف تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی تلاش کی مصروفیت ہماری زندگی کا اصلی کام تھی!

خاموشی ماگشت بدآموز بتاں را

انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا قصور نہ تھا، بلکہ خود ہمارا تھا۔ گورنمنٹ نے کبھی حقوق طلبی سے باز نہیں رکھا، کبھی فریاد کرنے والوں پر اپنا دروازہ بند نہیں کیا، کبھی تعزیرات ہند میں یہ دفعہ نہیں بڑھائی کہ پوچھنا اور مانگنا جرم ہے۔ اس نے معقولیت سے مانگنے والوں کی بسا اوقات عزت افزائی کی اور اکثر ان کی جرأتوں کو اور تیز کیا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس کی پہلی نظر اپنے مصالح پر تھی، اور اگر ایک قوم خود ہی اپنے تئیں اس کے فوائد شخصی پر قربان کر دینے کے لئے تیار کر دے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قبولیت سے انکار کرتی، علی الخصوص ایسی حالت میں کہ اس کی ضروریات کسی نہ کسی

ایک جماعت کو اپنے فوائد کے لئے قدرتی طور پر ڈھونڈھ رہی تھیں مسلمان اوگر راہ میں کھڑے ہو گئے کہ اس خدمت کیلئے ہمیں کو منتخب کیا جائے۔ وہ کیوں اس سے روکتی اور کیوں فائدہ نہ اٹھاتی ؟

عود الی المقصود

گزشتہ تمہید سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ ہمارا قدم جب کبھی اٹھا، غلط راہ پر اٹھا جس زمانے نے ہندوؤں کا ہاتھ پکڑا تھا، اس کو ہماری رہنمائی سے انکار نہ تھا کسی نہ کسی طرح ضرور ہم صحیح راستے پر چل نکلتے، مگر ہمارے لیڈروں نے ہمیشہ ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی کھلونا ایسا ڈال دیا جس کے مشغلے میں الجھ کر ہم کو اصلی کاموں کے اختیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ پہلے اعلیٰ تعلیم میں چالیس سال بسر کرا دیئے، پھر جب اس سے اکتا گئے اور دیکھا کہ قابو سے نکل رہے ہیں تو "مسلم لیگ" کا طلسم کھڑا کر دیا۔

مسلم یونیورسٹی

اس زنجیر کی آخری کڑی "مسلم یونیورسٹی" کی تحریک تھی، جو عین ایسے موقع پر شروع کی گئی جب کہ ملک کے در و دیوار سے تغیر و تبدل کی صدائیں اٹھنے والی تھیں اور ہندوستان خود گورنمنٹ ہی کی جرأت افزائی سے ایک نئے دور میں اپنے تئیں دیکھنے والا تھا۔ اتنے طویل عرصے کی غلط روی کے بعد اب شاید صحیح راستہ کی تلاش شروع ہو جاتی، لیکن "مسلم یونیورسٹی" کی ایک ایسی طول طویل داستان شروع ہو گئی جس کے پیچ در پیچ قصوں کو سنا کر اور ہر طرف سے کان بند کر دئیے گئے۔

نشۂ نیم شبی کا صبح خمار

(۱)

یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں میں اس وقت پہنچے گا، جبکہ لکھنؤ کی صحبتوں کو ڈیڑھ ہفتہ گذر چکا ہوگا، تاہم یقین ہے کہ لندن کی "صلح کانفرنس" کے بعد اگر کوئی تذکرہ ان کی صحبت میں ہوگا تو وہ لکھنؤ کی گذشتہ کانفرنسوں کی "معرکہ آرائیاں" ہوں گی۔

اخلاقی عقائد کی بہت سی گمراہیاں ہیں جن کے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور ہر موقعہ پر ان کا استعمال نہایت کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ خیال بھی ہے کہ صلح جنگ سے، اور امن شورش سے، بہر حال بہتر ہے۔

لیکن غور کیجیے تو اس خیال میں جس قدر سچ ہے، شاید اس سے کسی قدر زیادہ

مقدار میں جھوٹ بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ شورش سے سکون بہتر ہے، مگر کس شورش سے؟ سمندروں کے تلاطم، اور ہواؤں کی خوفناک موجوں کی شورش سے نہ کہ اس زندگی کی شورش سے، جس کے جاتے ہی موت کے سکون کا پیام آ جاتا ہے!

صلح بھی اچھی چیز ہے، مگر شاید وہ صلح اس سے مستثنیٰ کر دی جائے، جس کے مشیر (سرایڈورڈ گرے) ہوں۔

لکھنؤ کے ان جلسوں میں بھی امن کم اور شورش زیادہ تھی، صلح کا خیال محدود تھا اور جنگ کی طلب وسیع۔ امن و سکون اسٹیج کے کنارے تک بھی خالص نہ تھا، مگر جنگ کے ولولے سے ہال کی پوری فضا گونج گونج اٹھتی تھی۔

پس اس میں تو شک نہیں کہ یہ شورش بھی اور امن کی شورش سے بہتر ہے۔ اس میں بھی کوئی دھوکا نہیں کہ یہ ایک جنگ کی سرگرمی تھی، اور صلح فی نفسہ جنگ سے اچھی ہے۔ لیکن چونکہ اس شورش سے پہلے جو سکون تھا، وہ دریا کا سکون نہ تھا، جس سے مسافروں کی زندگی اور کشتیوں کی سلامتی وابستہ ہو بلکہ سکون تھا اس خواب غفلت کا، جو انسان کو زندگی کی حرکت سے محروم کر دیتا ہے، اور اپنے اندر موت کی ایک مثال کامل رکھتا ہے۔ (وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ) بلکہ وہ سکون تھا، اس جمود ممات اس نعش بے حرارت، اور اس جسد بے روح کا، جس کے لئے موزوں جگہ زمین کے اوپر نہیں، بلکہ اس کے نیچے ہے۔ اس لئے اگر بیداری ہشیاری سے، جنبش بیہوشی سے، اور زندگی موت سے بہتر ہو، تو یقیناً یہ شورش بھی امن سے، یہ جنگ بھی صلح سے، اور یہ ہنگامۂ دغوغا بھی خاموشی سے بہتر تھا۔ فَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بَعَثَ أَمَاتَنَا (پس تمام حمد و تقدیس ہو اس قدیر و حکیم کے لئے، جس نے

ہم کو ہشیاری کی زندگی عطا فرمائی، حالانکہ ہم غفلت کی موت میں ساکن و ساکت پڑے تھے)

لیکن اس عجائب سرائے بوقلموں میں ایک ہی وقت کے اندر سب کو خوشی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ شادی و غم میں باہم تصادم رہا ہے۔ اور ایک کی خوشی دوسرے کے لئے غم رہی ہے۔ اور غور کیجئے تو ایسا ہونا قدرتی ہے۔

دنیا میں رنج و خوشی اور شادی و غم کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے میں "حاصل" کی مسرت ہوتی ہے، اور دوسرے میں "رفتہ" کا افسوس۔ غم کی تمام مثالوں کو ایک ایک کرکے ذہن میں لائیے، ہر مثال میں آپ دیکھیں گے کہ کوئی نہ کوئی شے آپ سے جاتی رہی ہے۔ اور جانے ہی کا نام غم ہے۔ مفلس اداس رہتا ہے، اس لئے کہ دولت چلی گئی۔ بیمار غمگین ہوتا ہے، اس لئے کہ صحت جاتی رہی۔ مایوسی میں سب سے زیادہ غم ہوتا ہے، کیونکہ ایک چیز "امید" تھی، جو اس سے "بن گئی"۔ اسی طرح خوشی کے تمام مواقع یاد کیجئے۔ آپ ایک پرتکلف محل یا کسی قیمتی موٹر پر بیٹھ کر خوش ہیں، اس لئے کہ دولت ہاتھ آگئی۔ بیمار کے لئے غسل صحت کا دن کم از یوم عید نہیں، کیونکہ اسے صحت مل گئی۔ پس شادی و غم کی تعبیر اگر زیادہ واضح لفظوں میں کی جائے تو یہی ہوگی کہ حاصل ہونے کا نام خوشی ہے، اور کھو دینے کا نام غم۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ خوشی، کسی شے کے حاصل ہونے کا نام ہے، تو آپ کو جب کبھی کوئی چیز ملے گی، ضرور ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ سے نکلی ہو۔ عالم کائنات میں کوئی چیز بھی بیکار پڑی ہوئی نہیں ہے کہ آپ اٹھا بس گئے، ہر چیز کسی نہ کسی جگہ جڑی ہوئی ہے، آپ کو اٹھا لینے سے نہیں ملے گی بلکہ توڑنا پڑے گا، اور توڑیئے گا تو آپ کا دامن بھرے گا مگر کسی کی آستین ضرور خالی ہوگی۔ آپ پھولوں کی سیج پر لوٹ کر خوش ہوتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ

لوٹی نہ کوئی باغ اجڑا ہے، جب کہیں جا کو آپ کا بستر آباد ہوا ہے۔
(عرفی شیرازی)، جو بجائے شاعر ہونے کے ایک اسرار شناس حکیم تھا، اس نکتے کو کہہ گیا ہے:۔

زمانہ گلشن عیشے کرا بہ یغما داد؟
کہ گل بدامن ما دستہ دستہ می آید

(مرزا غالب) نے ایک دوسری بات کہی ہے، اگر آپ اسی نظر سے دیکھیں:۔

ہر جادہ کہ از نقش پئے تست بہ گلشن
چاکیست بجیب ہوس انداختۂ ما

پس دنیا میں آپ کا ہر نفع کسی دوسرے کا نقصان ہوا اور آپ اپنے نفع سے خوش ہیں تو دوسرا اپنے نقصان پر متاسف۔

لکھنؤ کے جلسوں میں جو کچھ ہوا، وہ دراصل ایک ابتدائی معرکۂ جنگ تھا جس نے مسلمانوں میں سب سے پہلے ایک نئے حریف مقابل کو دنیا سے روشناس کیا۔ قوم خوش ہو کہ اس نے طاقت حاصل کی، لیکن جن سے چھین کر حاصل کی اضرور ہے کہ وہ غمگین ہوں۔ آپ کو اگر اپنے بننے کی خوشی ہے تو کسی کو اپنے بگڑنے کا ماتم ہے۔ پھر اس کا کوئی علاج نہیں کہ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ قوم کی قسمت اب تک ایک جائداد منقولہ تھی جن پر چند اشخاص کا قبضہ تھا:۔ لا تسئل عما یفعل۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک نیا دعوے دار پیدا ہوا اور طاقت دکھلا کر اپنا حق لینا چاہا۔ آپ کسی کے قبضے سے اس کی مقبوضہ ریاست چھیننا چاہیں گے تو وہ ضرور روئے گا۔ ضابط وخوددار ہوگا تو کسی گوشۂ مکان میں رومال سے آنکھیں چھپا کر روئے گا۔ ضبط

اور بے قابو آدمی سڑکوں پر چیخ چیخ کر ماتم کریں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر معترض ہوں۔

دل از من، دیدہ از من، آستیں از من، کنار از من

(۲)

حزنی سادہ دل امروز دگر چوں ہر بار
بہ سخن ہائے غریب تو تسلی شد و رفت

فی الحقیقت ان جلسوں کے ذکر میں پہلی چیز جو سامنے آتی ہے، وہ لیڈروں کے اس اجباری و رہبانی اقتدار کے طلائی بت کا پارہ پارہ ہونا ہو، جس کی مشرکانہ پرستش کے برسوں سے مسلمانوں کے اجتہاد فکر اور آزادی رائے کو فنا کر دیا تھا اور جس کے رعب و ہیبت کے آگے آج تک قومی قوت کو ظاہر ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ قومی رائے اور آزادی خیال کی یہ ایک قوت تھی، جس نے پوری قوم کو ایک بے جان لاش بنا کر لٹا دیا تھا، لیکن لکھنؤ کے جلسوں میں اس لاش نے زندگی کی پہلی کروٹ لی۔ اور غالباً ہمارے لیڈروں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ چاندی سونے کی قوت کے علاوہ دنیا میں اور قوتیں بھی بستی ہیں۔

لیڈری کے اقتدار کا یہ بت عجیب الخواص تھا۔ یہ طلائی تھا، اس لئے جب کبھی شملے کی چوٹیوں سے آفتاب نکلتا، تو اس کا جسم ایک شعلۂ جوالہ کی طرح چمکنے لگتا، اس وقت دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، لیکن تاریکی میں اس کی صورت مہیب تھی، اور دیکھنے والوں کے لئے خوفناک۔ لکھنؤ کے جلسوں میں اس نے اپنی دونوں صورتیں دکھلائیں، وہ چمکتا بھی تھا اور مہیب بھی بنتا تھا،

لیکن نہ تو آنکھیں خیرہ ہوئیں، اور نہ لوگوں کے دل ہلے۔ بالآخر عاجز آکر مجبور ہوا کہ ایک عظیم الشان بت کا معبودانہ اقتدار و جلال چھوڑ کر، عام انسانوں کی طرح عاجزانہ مکر و سازش کی کوششوں سے کام لے، اور جس قوت کو میدانِ جنگ میں شکست نہ دے سکا اس سے سازش کے خیموں میں عہدہ برا ہو:۔ كَذٰلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ

ہم اس امر کو اتنی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ اب دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے بارہا لکھا ہے کہ قومی کاموں میں تنظیم اور تشکیل کے لئے جس درجہ لیڈروں کی ضرورت ہے، اس سے کہیں زیادہ ان کا خود مختارانہ اقتدار مضر اور مہلک بھی ہے۔ اسلام دنیا میں صرف اس لئے آیا، تاکہ انسانوں سے ان تمام اقتداروں کو چھین لے، جن کے ذریعے وہ تحکم اور جبر کے ساتھ غیر مسئولانہ حکومت کرتے ہوں۔ اور پھر خواہ یہ اقتدار دنیوی رؤساء کے ہاتھوں میں ہو، خواہ مذہبی پیشواؤں کے، حکومت کے ہاتھ میں ہو، یا کسی بت خانے کے پوجاریوں کے قبضے میں، کہیں ہو، اسلام اس کا دشمن ہے، اور اسکو شرک فی الصفات قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک غیر مسئول ہونا اللہ کی صفت ہے پس جو شخص اس صفت کو اللہ کے سوا کسی اور طاقت میں تسلیم کرتا ہے، وہ خدا کی صفت میں دوسرے کو شریک کرتا ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳: ۷۳)

وہ اس طرح کے اقتدار کو صرف "اللہ" کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے:
(ان الحکم الا للہ) اور اسی کو دین قیم قرار دیتا ہے: ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ پھر اگر اس اقتدار کا حق دنیوی امور میں کسی شئے کو ہے، تو وہ صرف قوت "شوریٰ" یا جماعت کا اجماع و مشورہ ہے، اور وہ بھی اپنے تمام اعمال میں احکام الہیہ کے تابع رہنے پر مجبور

پس یہ ایک شرک جلی تھا، جو ایک کھلی بت پرستی کی صورت میں تمام پیروانِ توحید پر مسلط ہو گیا تھا۔ ہر شخص جو (علی گڈھ) کو چندہ دینے کے لئے روپیہ رکھتا ہو، ہر شخص جس کے پاس علم کی جگہ چاندی سونا ہو، ہر دولت مند جو کسی اجتماع کے موقع پر ایک پر تکلف ڈنر دے سکتا ہو، ہر رئیس جس کے پاس سازشوں کے لئے بہت سی موٹر کاریں ہوں، ہر قیمتی پوشاک جس کی جیب بھاری ہو ہر آواز جس کے گرد ایک حلقہ تحسین ہو، غرضکہ ہر وہ شے، جس کا وزن بھاری، اور رنگ سنہری ہو، اس امر کا قدرتی حق رکھتی تھی کہ سات کروڑ انسانوں کا اپنے تئیں معبود و مسجود ظاہر کرے، اور قومی رائے، آزادی خیال، حق و صداقت، علم و فضل، تجربہ دانشمندی، غرضکہ دنیا کی ہر شریف قوت سے جبراً اپنے آگے سجدہ کرائے۔ اس کی رائیں حکم ہوں، اس کا حکم شریعت ہو، اور اس کی شریعت غیر منسوخ ہو: يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ۔

ہم نے لکھا تھا کہ اولین منزل لیڈروں کی لیڈری کا نہیں، بلکہ اس کی ہیبت و سطوت کے تسلط کا بت ہے، ایک مرتبہ بھی اگر یہ دیوتا گرا دیا گیا، تو پھر اس بساط پیشوائی کے تمام مہرہ ہائے اصنام خود بخود سرنگوں ہو جائیں گے۔ پس لکھنؤ میں جو کچھ ہوا، وہ اس امر کا ثبوت بیّن تھا کہ کم از کم اس مشرکانہ ہیبت کا بت تو قومی رائے کے گرز گراں سے مجروح ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ گذشتہ ایک سال کے عرصہ میں موسم کی تبدیلی کے آثار بالکل واضح اور ظاہر تھے، تاہم یہ پہلی شکست ہے، جو قوم نے افراد کو دی۔ توقع سے زیادہ اور امیدوں کے برخلاف، اور قومی زندگی کی یہ پہلی آواز ہے، جو مسلمانوں کی مجلس میں اٹھی، امید سے زیادہ قوی اور توقع سے زیادہ بلند، زنجیریں بہت بھاری تھیں، اور پاؤں مدتوں سے مقید، صیاد کا پنجہ سخت تھا،

اور صید بظاہر کمزور، لیکن الحمدللہ کہ رہائی کی پہلی کوشش کا تجربہ بے اثر نہ رہا، اور بند گو ٹوٹے نہیں مگر ڈھیلے ضرور ہو گئے:-

قائل تو ہو گئے ہیں وہ تاثیر عشق کے
موقع نکالنا سو یہ حکمت کی بات ہے

ہمارے عقیدے میں یہ انقلاب حالت ایک الٰہی کاروبار تھا، جو صرف اس لئے تھا تاکہ عبرتوں اور بصیرتوں کا موجب ہو تاکہ بہرے سنیں، اور اندھے بینا ہوں تاکہ اس ابدی و ازلی قانون کا [illegible] ب تیا معجزہ تم دیکھو کہ حق اور صداقت کی آواز کو کوئی قوت روک نہیں سکتی، اگرچہ شیطان کے بڑے بڑے مظاہر جمع ہو جائیں۔ اور سچ ہمیشہ سے ایک ابھرنے والا جوہر ہے، اگرچہ جھوٹ کی بڑی بڑی چٹانوں کو اسے دبا دیا جائے۔

درخت سب بوتے ہیں، لیکن ہر شخص کی نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی کھائے پس نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ، جو تخم پاشی کے بعد ہی اپنے دامن میں اس کے پھلوں کو بھی دیکھے۔ مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے، جن کو کانگریسی، باغی بے وفائے قوم، مفسد، اور اسی طرح کی بعض بعض اصطلاحات خاص سے یاد کیا جاتا تھا، مگر قوم کی قوم صرف اس شریعت پر عامل تھی کہ لیڈروں کی گاڑی کھینچئے ان کے ہر حکم پر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر سر بسجود ہو جائیے اور مسلمانوں کے لئے غلامی و استبعاد کی جو شریعت (پالیسی) انھوں نے مقرر کر دی ہے، اس سے سرمو تجاوز نہ کیجیے کہ:- "بے حکم شرع آب خوردن خطاست"

پھر غور کیجئے کہ اس نئی حرکت کے بیج کو جگہ پکڑنے، پھوٹنے، اور ابھر کر بلند ہونے کے لئے کتنی مدت ملی؟ اسباب ظاہری میں سے کیا سامان تھا، جو اسے میسر ہوا؟ زمین بظاہر ناموافق تھی، اور چند آوازد ل کے سوا، جن کے دبانے کے لئے دولت اجتماع سازش، اور رئیسانہ و حاکمانہ اقتدار، تمام قوتیں مستعد تھیں، کون تھا جس نے آبیاشی کی ہو؟ اعزاز ظاہری اور رسوخ دنیوی جن ہاتھوں میں ہے، ان میں سے ایک شخص بھی نہ تھا جس نے ساتھ دیا ہو مگر با ایں ہمہ آپ نے لکھنؤ میں دیکھا کہ درخت پیدا ہو چکا ہے، اور اس کی شاخیں قوی اور تنومند ہیں۔ پس یہ فی الحقیقت ایک بہت بڑی نعمت و احسان الٰہی ہے، جس کے شکر میں گردنوں کو سربسجود اور زبانوں کو زمزمہ سنج تحمید و تقدیس ہو جانا چاہیئے۔

ایک بڑی بصیرت جس کی صدا اس انقلاب حالت سے نکلتی ہے، یہ ہے کہ جو کوشش حق اور سچائی کے اعلان کے لئے کی جائیں، خواہ زمانہ کتنی ہی ان کی مخالفت کرے، لیکن وہ دریا کے پانی کی طرح اپنی راہ خود نکال لیتی ہیں، اور کبھی ان لوگوں کی محنت ضائع نہیں جاتی، جو اوروں کی معیت چھوڑ کر حق و صداقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ کارساز قدرت کا وعدہ ہے کہ: اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی (میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع و رائگاں نہیں کرتا) قرآن کریم میں ہر جگہ "والعاقبۃ للمتقین" فرمایا گیا ہے، اور اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ دنیا میں انجام کار کی کامیابی صاحبان حق و معروف ہی کے لئے ہے۔

پس ہم ان تمام حامیان حق و معروف کو مبارکباد دیتے ہیں، جنھوں نے پچھلے سال قوم میں آزادیٔ خیال اور طلب حقوق کی تحریک پیدا کرنے میں حصہ لیا۔

اُس نصرت فرمائے حق نے کس قدر قلیل عرصے کے اندر ان کی سعی مشکور کے نتائج حسنہ ان کو دکھلا دیئے۔

حق وصداقت کا اعلان کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت بڑی صبر وانتظار اور تحمل وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتنی پاک ہستیاں ہیں، جنھوں نے دنیا میں اس کے بیج بوئے، اور اپنی بڑی بڑی زندگیاں اس کی آبپاشی میں صرف کر دیں پھر کتنے جانفروشان حق وصداقت ہیں، جنھوں نے اپنے اشک ہائے امید اور خونہائے حسرت وآرزو سے اس بیج کے پودے کو سینچا، مگر با ایں ہمہ ان کی آنکھوں کو اس کے برگ وبار کا منظر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نسلوں پر نسلیں گذر گئیں، جب کہیں جا کر وہ بیج بار آور ہوئے۔

آج مسلمانوں کی اعمال زندگی کی ہر شاخ میں جو حالت ہو رہی ہے، وہ حامیان حق وصداقت سے ایسی ہی قربانیوں کی طالب ہے، جو صبر وانتظار کی انتہائی قوتیں اپنے اندر رکھتی ہوں، اور نتیجے کے لئے بے صبر نہ ہوں، بلکہ اپنے کام میں منہمک ومشغول ہوں۔ ہم ایک پوری قوم کو چاہتے ہیں کہ از فرق تا بقدم بدل دیں۔ انسانی اعمال و معتقدات کا ایک نقشہ ہمارے سامنے ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو یکسر الٹ دیں۔ ہمارے سامنے ایک سربفلک عمارت ہے، جس کی دیواریں پہاڑوں کی چٹانوں سے، اور جس کی چھتیں لوہے کی سلاخوں سے بنائی گئی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو مسمار کر دیں، اور ایک ایسی نئی عمارت بنائیں جس کی چھت ہی نہیں، بلکہ بنیاد بھی نئی ہو۔ پھر اگر یہ ارادہ عظیم ہے، تو ضرور ہے کہ انتظار کی قوت بھی شدید، اور صبر کا پیمانہ بھی بڑا ہو۔ اس راہ کے مسافر کی تسکین کے لئے یہ بس کرتا ہے کہ راہ صحیح اور موصل الی المقصود

ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ ہمارے ہی قدم منزل مقصود تک پہنچیں۔ ہم نہ ہوں گے، مگر ہمارے نقش قدم پر چلنے والے منزل مقصود تک پہنچیں گے، اور جو سفر کا خط ہم نے کھینچ دیا ہو۔ وہ ان کی کامیابی کے آخری نشان تک رہنمائی کرے گا۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ!
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ!

جب حالت یہ ہو، تو پھر اس انقلاب کے ظہور کو کیوں نہ ایک غیبی نصرت اور ایک احسان الٰہی سمجھا جائے، جس کی کوششوں کے نتائج ایک سال سے بھی کم عرصے میں ظاہر ہوگئے، اور جو بیج سالہا سال کے انتظار کی برداشت کے بعد برگ و بار لاتے ہیں، انھوں نے چند مہینوں کے اندر ہی اپنی ٹہنیاں پھیلا دیں؟ البتہ یہ جو کچھ ہوا محض ایک ابتدائی مظہر نصرت، اور مستقبل کا پہلا نمونہ تھا، پھر تغیر صرف ایک محدود دائرہ کے اندر ہوا؛ اور ابھی ہمارے اعمال و معتقدات کے وہ اصل اصول باقی ہیں، جن کے مقابلے میں جماعتوں اور گروہوں کے متفقہ جہاد کی ضرورت ہو۔ میں اس تغیر کو اس لحاظ سے یقیناً اہمیت دیتا ہوں کہ وہ تغیر تھا، اور مسلمانوں کی حالت مدتوں سے غیر متغیر ہو رہی تھی۔ پس تغیر خواہ کتنا ہی ابتدائی اور ضعیف ہو، مگر جمود کی شکست کا مخبر ہے۔ ورنہ اس بارے میں میرے خیالات بہت وسیع، اور پیش نظر مقاصد بہت بلند ہیں۔ مشکل ہے کہ اس وقت آپ کی نظریں وہاں تک پہنچ سکیں۔ میں صرف اس نقطہ پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کام کرنے والے اپنے کاموں کے لئے اس تغیر کے تذکرے سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی کوششیں اگر ابھی سالہا سال تک ایک ادنیٰ سا تغیر بھی پیدا نہ کر سکتیں، جب بھی ان کو مایوس نہ ہونا تھا، چہ جائیکہ اس قدر جلد ایک سخت

و نمایاں تغیر ان کو کامیابی کا مژدہ دے رہا ہے، اور یقین دلا رہا ہے کہ محنتوں کے نتائج کے لئے زیادہ صبر و انتظار کی آزمائش نہیں ہے، بس وہ اپنی ہمتوں کو اور قوی کریں، عمل کی رفتار تیز کردیں، اور اپنے ایمان و ایقان میں محکم تر ہو جائیں کل سعی کی اس لئے ضرورت تھی کہ بہرحال سعی کرنی چاہیئے، لیکن آج اس لئے ضرورت ہے کہ خود نتائج بھی سعی کی دعوت دے رہے ہیں، کل تک لوگ غافل تھے، پس ضرور تھا کہ انھیں ہوشیار کیا جائے، مگر اب لوگ آنکھیں مل رہے ہیں، پس ہم کو بھی اٹھنے والوں سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

بایں کہ کعبہ نمایاں شود ز بام نشیں
کہ نیم گام جدائی ہزار فرسنگ ست

اگر ہوا موافق نہ ہو، دریا مہربان نہ ہو، اور ستارے رہنمائی نہ کریں تو کشتیبان کیا کرسکتا ہے؟ لیکن تاہم اگر کشتی سلامت جائے تو کشتی چلانے والے کا حق تعریف کوئی چھین نہیں سکتا جو تغیرات اس وقت مسلمانوں کے خیالات میں ہوئے ہیں، وہ ایک قدرتی نتیجہ ہے ان تغیرات کا، جنھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کرلیا ہے، تاہم جن لوگوں نے ان تغیرات کا ساتھ دیا، اور ان کی صدا کے سننے کے لئے دلوں میں استعداد پیدا کرائی، ضرور ہے کہ اس معلول کے "علل" میں ان کو بھی شمار کیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے نواب وقارالملک بہادر قبلہ کے اس مضمون کا ذکر کرنا چاہیئے جو انھوں نے دربار دہلی سے آکر علی گڈھ گزٹ میں لکھا تھا، اور جس میں گو کسی اصول کی طرف دعوت نہیں دی گئی تھی، مگر مسلمانوں کے "مسلمہ قومی پالیسی" کے بت پر یقیناً اس سے ایک ضرب کاری لگی۔

اس کے بعد شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بعض مضامین مسلم گزٹ میں لکھے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ انھوں نے تغیر خیالات میں سب سے زیادہ مدد دی اسکے ساتھ ہی مسلم گزٹ کی اشاعت بھی قابل ذکر ہے، جو الحمدللہ کہ بدستور خدمت ملت میں سرگرم، وقلع قمع استبداد سیاست میں مصروف پیکار ہے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے شیوہ آفرین دوست مسٹر محمد علی کو بھی نہیں بھول سکتے، جنھوں نے فی الحقیقت یونیورسٹی کے معاملے میں آزاد خیالی کی تعلیم متصل اور پیہم رکھی، اور جس نے موجودہ حرکت کی تشکیل میں بہت زیادہ مدد دی۔

اس موقع پر یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا، محض سیاسی اعتقادات کا تغیر ہے، اور میں اس وقت کا منتظر ہوں جب کسی صحیح مذہبی تبدیلی کا ثبوت بین نمایاں ہو، کیونکہ بغیر اس کے کوئی ہنگامۂ تغیر میرے لئے تشفی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ چونکہ نئی گرفتاری کے لئے پچھلی گرفتاری سے آزاد ہونا ضروری ہے، اس لئے اس تغیر کو بھی اس سلسلے کی ابتدا سمجھتا ہوں۔

یہاں تک تو ہم نے لکھنؤ کے جلسوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے، جہاں تک ان کا تعلق تغیر خیالات، اور قومی رائے کے اظہار قوت سے ہے، لیکن اب اس نتیجے پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے جو اس معرکہ آرائی کے بعد پیدا ہوا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معرکہ ابتدائی، اور حریف نو آموز تھا جنگ میں علانیہ ہتھیاروں ہی سے نہیں، بلکہ سازش و خدع کے چھپے ہتھیاروں سے بھی کام لیا گیا۔ اس لئے با ایں ہمہ اظہار قوت و مقاومت قوم کو شکست ہی قبول کرنی پڑی۔

تاہم اس شکست کو شکست نہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ دراصل قوم نے اپنے حریفوں

سے شکست نہیں کھائی، بلکہ اس دھوکے میں آکر تلوار رکھ دی کہ اب مقابل حریف نہیں؛ بلکہ خود اسی کے تیغ آزما ہیں۔ حریفان شاطر نے جب دیکھا کہ دست و بازو شل ہوگئے ہیں، اور آئندہ جنگ کی طاقت نہیں، تو پھر یہ تجویز کی کہ صلح کی ایک سازش گاہ منعقد کی جائے، اور قوم کو خود قوم کے بھیس میں آکر شکست دی جائے۔ بے خبروں نے یکا یک ایک صدائے صلح سنی۔ نادان سمجھے کہ ہماری آواز ہے، حالانکہ لب و لہجہ بدلا ہوا تھا مگر آواز انہی کی تھی جو اب اس ظاہر کا باطن ہو گئے تھے۔

دہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا رکھ لیجیو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

اس اجمال کی تفصیل اب کیا کریں کہ وقت گذر گیا:۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

تاہم نواب صاحب قبلہ نے یہ مضمون لکھ کر گذرا ہوا ورق پھر الٹ دیا ہے۔ فونڈیشن کمیٹی کا پہلا دن فی الحقیقت "بزرگان قوم" کے لئے ایک "یوم الفزع الاکبر" تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ "الحاق" اور "مسلم" کے انتساب کا جھگڑا چکانے آئے تھے، یہاں میجر سید حسن بلگرامی نے اختیارات کی ایک نئی بحث چھوڑ دی:۔

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

جلسے کے وقفوں میں اس تجویز کے استرداد و ترمیم کی پوری کوششیں کی گئیں۔ اور اسٹیج کے میدان میں جس قدر حربے دکھلائے جا سکتے تھے، ایک ایک کرکے سب سے کام لیا، مگر معلوم ہوا کہ ڈھال چمڑے کی نہیں بلکہ پتھر کی ہے۔ نہ دور کے تیر کام دیتے ہیں نہ سامنے کی تلواریں۔ لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ تجویز کے خلاف تمام ہال سے ایک آواز بھی اٹھنے والی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر اس وقت

دوٹ لیے جاتے تو نتیجہ معلوم تھا کہ کیا نکلتا۔ اس لیے مصلحت نے سرگوشی کی کہ ایک دن کے وقفے کے بعد بقیہ کارروائی دوسرے دن پر ملتوی کردی جائے۔ یہی وقفہ قیامت کا وقفہ تھا۔

کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

یہ جوش عام لوگوں نے طبقۂ مستبدین کے خلاف جلسے میں ظاہر کیا تھا، اس میں شک نہیں کہ اس میں بے اعتدالی اور تفریط ضرور تھی، لیکن چونکہ گیند بہت زور سے زمین پر پٹکا گیا تھا، اس لیے اس کے دور تک اچھل کر بلند ہونے کی بھی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ قدرتی امنگوں اور قوتوں کو دبایئے گا تو اور زیادہ اچھل کر نمودار ہوں گی۔ پھر جن لوگوں نے برسوں پھیکے پکوانوں سے اپنی اونچی دوکانوں کو سجایا تھا، اگر آج ایک وقت کے لیے ضرورت سے زیادہ نمک کھانے میں پڑ گیا، تو کم از کم ان کو تو شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ اگر یہ بے اعتدالی بھی تھی تو بے اعتدالی ہی کے جواب میں:۔

محتسب خم شکست و من سر او
سن بالسن والجروح قصاص

دوسرا دن گذشتہ کے ماتم اور آئندہ کی فکروں میں بسر ہوا اور بالآخر اس "شام بلا" کی تاریکی قیصر باغ کی برجیوں پر نمودار ہو گئی، جس کی پردہ پوش تاریکی میں نہیں معلوم کیا کیا کچھ ہونے والا تھا۔ یاران شاطر نے اس تاریکی کی فرصت کو "مطلب براری" کے لیے غنیمت سمجھا کہ رات بھر کی مہلت میں کسی کی حریف نوازی اور نرم دلی جس قدر جرأت دلائے، متمتع و کامیاب ہو رہیئے، ورنہ پھر صبح ہجراں کا

مطلعِ محشر نمودار ہونے کے لئے سر پر کھڑا ہے۔

کہ درتا خیر آفتہا، دعاشق رازیاں دارد

اسنے میں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہی۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف، اوران نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف، حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ نہیں، شکست کا اعتراف ہی:۔

چشم اگر اینست، وابروایں، وناز وعشوہ ایں،

الفراق اے ہوش و تقوی! الوداع ای عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہوجاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے، اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی، کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے، اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدوں سے!

مگر افسوس کہ دوسرے دن ہماری طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا۔ طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہی نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں، تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لئے تیار ہیں کہ "شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

(۳)

وہ شیفتہ "کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی"!
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

مرغ اسیر کی گرفتاری اور صیاد بے مہر کی تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعرا کی بدولت ایک دلچسپ داستان بن گئی ہے۔

فرض کیجئے کہ کوئی قیمتی چڑیا آپ نے ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں سے پکڑی ہو، اور اس کا مضغۂ ضعیف آپ کی مضبوط مٹھی میں اس طرح دبا ہوا ہو، کہ ذرا انگلیوں کو اور سخت کیجئے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہوجائیں۔

لیکن یکایک آپ کو ایک ٹھوکر لگی، اور اب جو دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہے، اور وہ صید ستم سامنے کے کسی درخت کی بلند ٹہنی پر بے فکر و بے پروا بیٹھا ہوا چہچہا رہا ہے، گویا اس طرح آپ کو چیلنج دے رہا ہے کہ صیادی کا دعویٰ ہے، تو یہاں آکر گرفتار کیجئے! آپ حسرت سے دیکھتے ہیں اور انقلاب حالت پر خوںبار ہیں! اللہ اللہ! ابھی چند لمحے پہلے جو مشت پر وبال اپنی زندگی و موت کے لئے ہمارے رحم کا محتاج تھا! اب ہماری اس بے بسی و لاچاری پر اپنی آزادانہ پرفشانیوں سے طعنہ زن ہے!

بعینہ یہی حال فونڈیشن کمیٹی کے پہلے اجلاس کا تھا۔ وہ صیادان سخت پنجہ جنھوں نے قومی آزادی اور جماعتی رائے کی سنہری چڑیا کو برسوں اپنی آہنی انگلیوں میں دبا کر مقید کر رکھا تھا اور استبداد گرفت کا یہ حال تھا کہ اف کرنے کی بھی اجازت نہ تھی، اب چشم تر اور نگاہ خوںبار سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ہی جست برق رفتار

میں ان کے قبضے سے نکل گئی ہے، اور وہ ہاتھ، جو کل تک کسی کے پر و بال مقید سے بھرے ہوئے تھے، اب خالی ہیں تاکہ جی بھر کے اپنی محرومی اور بے بسی پر ماتم کرلیں۔ ناکامی سے بڑھ کر ناکامی کے طعنوں کی تکلیف ہوتی ہے۔ ستم یہ تھا کہ یہ بے مہر چڑیا اڑ کر چلی نہیں گئی تھی، بلکہ سامنے کے ایک درخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی اپنے پروں کو ہلا ہلا کر یاد دلاتی کہ یہی پر تھے، جن کو آپ کے قبضے میں حرکت کی بھی اجازت نہ تھی، لیکن اب کس طرح ہوا میں پھیلائے جا رہے ہیں؟ کبھی گردن ہلا ہلا کر چہچہاتی اور اس میں یہ دلدوز طعنہ مضمر تھا کہ کل تک یہی زبان تھی جو کسی کے خوف و ہیبت سے ہلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی آج آپ کی زبان بھی اس کے سامنے کھلتے ہوئے کٹ کٹ جاتی ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔

بہرحال انقلاب حالت نے لیڈروں کے کیمپ میں ایک تہلکہ مچادیا، پچھلی جنگ کی ہزیمت سامنے تھی اور آئندہ کی خوفناک ہزیمتوں کے تصور سے اس "لیڈری" کے "سومنات" کا ہر بت لرزاں و ترساں تھا:

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ، قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ (۶۸ : ۳۰)	پس لگے آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے، اور آخر کار سب بول اٹھے کہ ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم بڑی نافرمانیوں اور گمراہیوں میں مبتلا تھے!

تاہم ایک ہی رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی، اور جو کچھ ہونا تھا، ضرور تھا کہ طلوع آفتاب کی روشنی سے پہلے ہی انجام پا جائے۔ پس جب "سومنات" کے چھوٹے بتوں نے دیکھا کہ ہمارا عمل السحر کچھ کام نہیں دیتا، تو:-

قَالَ اَوْسَطُهُمْ، اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (۲۸:۱۸)	ان میں سے جو سب سے بہتر آدمی تھا، کہنے لگا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ اپنے

(اس آخری) معبود ہی کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے (جو تمام مشکلوں کو حل کرنے والا ہے؟)

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ طاقتوں اور قوتوں کے اس "بت اعظم" سے کیوں نہیں خواستگار اعانت ہوتے، جس کی سحر کار آنکھوں کی برق بخشی سے اس مندر کے تمام چھوٹے بڑے سنگی بت طاقت حاصل کرتے ہیں؟

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى، وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى؟ (۱۹:۵۳)	پھر کیا تم نے "لات" اور "عزیٰ" نامی بتوں کو نہیں دیکھا ہے؟ اور وہ جو ایک سب سے بڑا تیسرا بت اور ہے، اور

جس کا نام "منات" ہے؟

دعا مستجاب ہوئی اور بالآخر "اعمال و اشغال مخفیہ" کی یہ عظیم الشان رات اس طرح شروع ہوئی کہ سب سے پہلے اس "مقدس عمل تسخیر" کو انجام دیا گیا، جس کا ظاہری و سادہ نام ظاہر میں لوگوں کی زبان میں (ڈنر) ہے، اور ہماری اصطلاح میں:-

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ، وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

رو ایان صداقت شعار، اور ناقلان عدالت آثار روایت کرتے ہیں کہ یہ "عمل" ساڑھے بارہ بجے تک بجمیع شرائط جاری رہا:-

اور جو کچھ کہ ہوا، قابل اظہار نہیں

"تسخیر کواکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا ہم کو کیا معلوم؟ ان سے پوچھئے جنھوں نے اس فن کے علم و عمل، دونوں میں دستگاہیں حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد

جیسا اہم ہوتا ہے، اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ "قران السعدین" نہیں بلکہ "قران النحسین" کا سامان کرنا تھا، مریخ اور زہرہ، دونوں کو جمع کرنا تھا اور مشتری کے گرد حلقہ کھینچنا تھا تاکہ "زحل" کے قران سے باہر قدم نہ نکلے۔ بہر حال عامل کا پنجہ سخت تھا، مریخ اور زہرہ، دونوں کو ایک دائرے میں جمع کر ہی کے چھوڑا، یہاں تک کہ "زہرہ" سے باایں ہمہ ناز و عشوہ، وعدہ لے لیا گیا کہ عین حضرت "مریخ" کے برج کے سامنے، اپنا رقص ہوش افگن نظارہ گیان ارضی کو دکھلائے گی۔

اس صحبت فلکی میں تو یہ عجائب و غرائب انجام پا رہے تھے، اور ادھر زمین کے بسنے والوں کی قسمت سر پیٹ رہی تھی:۔

بگذر ز سعادت و نحوست، کہ مرا
ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بقہر!

اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں، ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری ٹکڑوں کے لئے آگ کی آزمائش باقی ہے۔ ۲۶ دسمبر کے جلسے میں جبکہ لفظوں کی جگہ زبان سے شعلے نکل رہے تھے، تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے:۔

مجلس طرازیوں کے چکھاؤں گا سب مزے
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے!

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی، اور بہت جلد تنہائی کا "گوشۂ خلوت"، ہاتھ آگیا خلوت کے اسرار و نیاز محرمان مجلس تک تو پہنچتے نہیں، ہم ایسے غیروں کو کیا خبر؟

تاہم یہاں تک تو تمام راوی متفق ہیں کہ (راجہ صاحب) نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور کہا کہ اگر ہرانا ہی چاہتے تھے تو ہار جانے کا اقرار کرتے ہیں۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!

کہا جاتا ہے کہ (راجہ صاحب) نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی رام نہ کئے جائیں گے، کچھ نہیں ہوگا" یہی سبب ہے کہ اس "خلوت شب" کی بارات کا دولھا انہی کو بنایا گیا، اور رات بھر "سہرے" کی تزئین و آرائش میں صرف ہوگئی۔ خیر، ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ رات بھر کی بیداری خلوت میں کیا کچھ کیا گیا؟ ہم تو صبح کی چشم خمار آلود، اور زلف پریشان کی ادائیں دیکھنے والوں میں تھے، اور یہ جو اپنے حصے میں آیا، تو ایسر شاکی بھی نہیں۔ ہمارے دوست کے ہم وطن بلکہ ان کے سابق رئیس (یوسف علی خاں ناظم) کا فلسفہ اس موقع کے لئے ہمیں یاد تھا:۔

ادائیں شب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں مگر
ہم ان کی بگڑی ادائیں سحر کو دیکھتے ہیں

خیر، یہ تو اس "شب وصل" کی شام تھی، اس کے ذکر کو کہیں جلد نبٹائیے کیونکہ اصلی پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے، جبکہ رندان بادہ گسار نے "جلسۂ نیم شبی" آراستہ کیا، اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریک پیمان کی قسمت خفتہ کو مژدہ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا:

وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوابی تنہا!

"ذکر عیش بہ از عیش" یعنی:۔

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے!

چشمِ تصور سے کام لیجیے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں، لیلائے شب کی زلف کمر سے گذر چکی ہے، ایک کنجِ خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی:

دھری شراب ہے، بیٹھے ہیں جابجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کو الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی "دوست" کی توبہ نے لغزش کھائی، اور اس جامِ عہد فراموش کو منہ سے لگاتے ہی بنی، جو کسی کے "دستِ طلائی" نے پیش کیا تھا، تو انصاف کیجیے، آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟ اور پھر یہ تو وہ مقام ہے کہ ہاروت و ماروت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے تھے:-

ساقیا مرنج از من، عالم جوانیہاست!

خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ!! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "پر اسرار" صحبتیں!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم، اور بعض نوجوان و نوآموز مدعیانِ حریت، پھر شغلِ مے پرستی کا یہ عالم اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟

مست بر بسترِ من افتد و رنداں دانند
حالتِ مست، کہ بر بسترِ ہوشیار افتد

آپ ادھر کی سنئے۔ یہاں تو شب زندہ دارانِ بادہ گساری "صبحِ خمار" کی اعضا شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے، اور ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا

ہال تماشائیان زم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصول مقصد کے لئے جو تدابیر گوناگوں و بوقلموں اختیار کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسہ کے لئے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا، اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا، کیونکہ آج اسٹیج پر پردے سے جو پتلیاں نکلنے والی تھیں، وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کئے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں، اس لئے ضرور تھا کہ (باصطلاح عوام) اس "تماشہ گھر" کے لئے ٹکٹ بھی مقرر کیا جائے۔ لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لئے پہلے تو یہ شرط لگائی گئی کہ صبح آٹھ بجے سے پہلے لے لئے جائیں حالانکہ جاڑوں میں آٹھ بجے تک رات کی کہر سے فضا بھی صاف نہیں ہوتی۔ پھر ٹکٹ کے لئے تھیٹر کے صدر دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے ہال جائیے۔ راجہ صاحب کے ہال سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں، اسی طرف پچھلے پاؤں پھر جائیے۔

یاں سے واں، واں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

اس سے غالباً مقصود اصلی یہ تھا کہ ان مشکلات کی وجہ سے آزاد خیال طبقہ کی مجاریٹی جمع نہ ہو سکے۔ یہ بھی خبر اڑی کہ ایک جماعت کل سے کہہ لئے باہر سے ٹھیکے پر بلائی گئی ہے ایک جماعت راوی ہے کہ پولیس کی قوت سے بھی کام لینے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ لیکن صبح کو پھر ان تمام انتظامات کے عمل میں لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے، کہ جب خیموں میں باہم صلح کر لی ہے، تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف؟ ناظم پاشا جب ساتھ

مل گیا تھا، تو کامل پاشا بے فکر ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فوج کی اصلی قوت اس کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو، لیکن اس وقت تو ضرور رہی۔

غرضکہ آٹھ بجے سے جلسہ منعقد، اور "صاحبان حل و عقد" کا منتظر تھا، لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں، اور اب پتہ لگے تو کیونکر؟ جس جنگ کے لئے یہاں فوج جمع تھی، اس کی صلح رات کے دو بجے کی تاریکی ہی میں انجام پا چکی تھی۔ اب جلسے میں شرکت کے لئے کیا ایسی جلدی آپڑی تھی، جو جلدی کی جاتی؟ بہر حال ادھر رونمائی میں دیر، ادھر مشتاقان دید کی بے صبری، عجیب کش مکش تھی:

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر!
ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

خدا خدا کر کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بطور مقدمۃ الجیش کے تشریف لائے۔ گو خود ان کا آنا جلوۂ یوسفی نہ تھا، لیکن اپنے ساتھ "نسیم پیراہن" کی بشارت ضرور رکھتا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے "صحبت نیم شبی" کا اعلان کیا، اور جنگل میں منادی کرنے والے "یوحنا" کی طرح خبر دی کہ "راہ صاف کرو، کیونکہ آسمان کی بادشاہت اب قریب ہے!!"

یہانتک کہ دس بجے۔ صدہا نظرہائے منتظرہ، اور صدہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی "ارباب حل و عقد" کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور "جملہ سازش[1]"

---

[1] سازش کا لفظ شاید پہلے بھی کہیں گذر چکا ہے، لیکن یہ میری جانب سے نہیں ہے، بلکہ بجنسہ نواب صاحب قبلہ کا لفظ ہے، جو انھوں نے اپنے مضمون میں دو جگہ استعمال فرمایا ہے۔ منہ۔

کے تمام "عروسانِ شب زندہ دار" ایک ایک کرکے نظر نواز بزم و انجمن ہوئے۔ چہروں نے پہلی ہی نظر میں ارباب نظر سے رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں۔

شب تو شراب خوردہ، با تو صد نشانہاست

انھی میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے، صحبت نیم شبی کا خمار آنکھوں میں، اور شب بیداری کی افسردگی چہرے پر، جی میں آیا کہ بڑھ کے پوچھیں :-

تو شبانہ می نمائی، بہ برکے بودی امشب؟
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد!

لیکن ہمارے دوست نے اپنی ایک رات کی حریف پرور اداؤں کے لئے دوستوں کا ایسا حصار ہجوم پیدا کر لیا تھا، کہ اب اس کا موقع ہی کب باقی رہا تھا؟

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں

دراصل اب فونڈیشن کمیٹی کی تمام بحث آکر اس پر ختم ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر میجر سیّد حسن بلگرامی کا رزولیوشن منظور ہو یا غیر منظور۔ تمام دیگر مسائل طے پا چکے تھے اور اصلی پتھر جو ارباب کار کو حصول یونیورسٹی کی راہ میں نظر آتا تھا، یہی رزولیشن تھا۔

اس رزولیوشن کا مقصد فی الحقیقت کسی قومی یونیورسٹی کے لئے اصل مبنیٰ، اور بمنزلہ بنیاد کار کے تھا، یعنی گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ رزولیوشن

کے الفاظ یہ تھے

"قوانین کالج کی دفعہ ۱۴ ضمن ۵ - میں جو اختیارات اس وقت پیٹرن کو حاصل ہیں، ان سے زیادہ اختیارات یونیورسٹی کی صورت میں، حضور وائسرائے کو بحیثیت چانسلر نہ دیے جائیں۔"

میجر صاحب نے اس تجویز کو بعد از ہزار سعی و مجاہدت پیش کیا، اور تمام آزاد خیال طبقے نے (جو قوم کو قومی یونیورسٹی کے دھوکے میں ایک گورنمنٹ یونیورسٹی خریدنے سے بچانا چاہتا تھا، اور جس کی قیمت میں علی گڈھ کالج بھی ہاتھ سے جاتا تھا) ساتھ دیا اور آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ اب جو وہ تشریف لائے، تو اسٹیج پر آتے ہی میں نے ان سے پوچھا: فرمائیے کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ "صلح کاری" کے ساتھ کام کرنا بہتر ہے، اور مجھ کو یقین دلایا گیا ہے کہ بحالت موجودہ میرا رزدلیوشن پاس نہیں ہو سکتا (حالانکہ آخری خیال درست نہ تھا)

میں نے اسی وقت "اناللہ" کا جو برسوں کی شام کو زبان پر گذرا تھا، اعادہ کیا کہ اپنے قیاسات کی پوری تصدیق ہو گئی۔ اب صلح کی خواہش ہے، گو تمام یورپین ٹرکی ہاتھ سے جائے۔

میجر صاحب کانفرنس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے اور فی الحقیقت جس قابلیت اور صداقت کے ساتھ انھوں نے اپنے فرض کو ادا کیا، وہ ان کی عظمت کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ پس بہتر تھا کہ وہ فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں حصہ نہ لیتے اور اس رزدلیوشن کو پیش ہی نہ کرتے۔ وہ نئے نئے قوم کے سامنے آئے اور آتے ہی اپنے تئیں ایک آزمائش میں ڈال دیا، حالانکہ آزمائش کی راہ

دوسری ہے :۔

عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

۲۶ کی سہ پہر کو ہمیں خیال ہوا کہ کہیں میجر صاحب کی استقامت "ارباب حل و عقد" کے مقابلے میں مرعوب نہ ہو جائے، ہم نے خیال کیا تھا کہ اگر وہ اپنی تجویز میں ترمیم پسند کریں گے یا واپس لے لیں گے تو معاً کوئی دوسرا شخص اس کو پھر پیش کر دے گا۔ لیکن افسوس کہ ۲۸ کی صبح کو حالت بدل گئی ہم ایک شعر یاد کرنے لگے جس کا پہلا مصرعہ یاد نہیں آتا تھا دوسرا مصرعہ یہ ہے :۔

اگر ماند شبے ماند، شبے دیگر نمی ماند !

باوجودیکہ مجلس "نیم شبی" کے قول و قرار صلح سے دل مطمئن اور منصوبے قوی تھے۔ لیکن پھر بھی جنگ کے اجرا کا خوف دلوں میں باقی تھا اس کے لئے علاوہ اور بہت سی تدابیر مختلفہ کے جو بارہ دری کے دروازے اور خود اندر ہی کی گئی تھیں، ایک خاص تدبیر خود اسٹیج پر بھی ارادوں کی مخبری کرتی تھی۔ دو قطاروں کی مصنف پلٹنیں، پریزیڈنٹ کی کرسی اور میز کے چاروں طرف فرش پر بٹھائی گئی تھیں، اور نہیں معلوم اس طغیاری محاصرے کا (انڈیا نوپل) کونسا تھا؟ بعض اشخاص جو کل تک جلوس میں اپنی پگڑیوں کے ذریعے ممتاز تھے، ہم نے خاص طور پر دیکھا کہ آج کے پیش آنے والے واقعات سے متنبہ ہو کر ترکی ٹوپی یونی فارم سے لیس ہو کر آئے تھے، شاید اس لئے کہ اوروں کے پگڑی اتارنے سے پہلے خود ہی اتار بیٹھیں یا اس لئے کہ جنگ کے موقعے جس مستعدانہ چستی اور چالاکی کے خواہاں ہوتے ہیں، ان کے لئے پگڑی کے زر، دگسل پیچ مناسب حال نہیں۔

ہم نواب (وقار الملک) بہادر کے پیچھے ہی بیٹھے ہوئے تھے ہم نے دیکھا کہ اس حالت کو بطور خود نواب صاحب قبلہ نے محسوس فرمایا، اور ان لوگوں سے باصرار کہا کہ اس طرح نہ بیٹھیں، غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ اس سے لوگوں کو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ (مگر یہ آخری جملہ یقینی طور پر یاد نہیں، ممکن ہے کہ کسی اور نے کہا ہو) لیکن وہ نبرد آزمایانِ جنگ، جو آج اپنے دست وبازو کے جوہر دکھلانے کے لئے جمع ہوئے تھے، بھلا ان نصائح واحکام کی کب پروا کرنے والے تھے؟

اس ہجوم وحصار سے ایک خاص مقصود بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ اگر کوئی شخص مخالفت میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ ہو تو اس کو بروقت اس کا موقع ہی نہ ملے کیونکہ اوّل تو مقرر کے لئے کھڑے رہنے کی کہیں جگہ ہی نہ تھی، دوسرے اس محاصرے کی صفوف کی وجہ سے راہ مرور اس طرح بند ہوگئی تھی، کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی منٹوں کی جد وجہد مطلوب تھی۔ خود ہم اور خواجہ غلام الثقلین اگر اتفاق سے بالکل اسٹیج کے کنارے پیشتر ہی سے بیٹھے ہوئے نہ ہوتے، تو تقریر کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہوتا، کیونکہ جتنی دیر میں مخالف اٹھ کر کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرتا، اتنی دیر میں رزولیوشن پاس ہی کر دیا جاتا (جیسا کہ بعد کو بہ جبر کیا گیا)

ایک اور تدبیر خاص وہ تھی، جس کے ذریعے موافقت کے چیرز اور مخالفت کا شور وہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، یعنی اسٹیج پر بیٹھنے والی جماعت کا ایک طبقہ نیچے مجلس کی مختلف قطاروں میں متفرق ہو کر بیٹھ گیا تھا، تاکہ وقت ضرورت مجمع کے ہر حصے سے ایک ایک صدائے موافقت اٹھ کر شور مچائے، اور معلوم ہو کہ ہر طرف سے صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ اس انتظام کا سلسلہ آخر مجمع تک

موجود رکھا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے کی تمام کرسیوں پر بھی شرکائے راز اشخاص بٹھائے گئے تھے، تاکہ اگر کوئی مخالفت میں تقریر کرے، تو معاً پیچھے سے آوازیں اٹھنا شروع ہوجائیں، اور اس کے ہنگامے میں مجمع کی مخالف صدائیں مدغم ہوکر مفقود ہوجائیں چنانچہ جونہی آنریبل خواجہ غلام الثقلین نے ترمیم پیش کی، گو وہ مخالفت میں نہ تھی، بلکہ صرف ترمیم تھی، تاہم شور وغل کی آوازیں معاً سنائی دینے لگیں۔

ہم نے یہ بھی سنا تھا (والعھدۃ علی الراوی) کہ رات کے پیمان و عہد کے بعد بعض ممتاز آزادی خواہ اشخاص نے ایک کاغذ اپنی تمام جماعت میں پھرادیا تھا، جس میں "صحبت نیم شبی" کے صلح نامے کا ذکر تھا، اور لکھا تھا کہ اب ۲۶ کے جلسے کے تمام آزاد خیال لوگوں کو اسی کی تائید کرنی چاہیئے، اور کسی مزید مخالفت کی ضرورت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک یہ درست ہے؟ مگر بارہ دری کے دروازے پر جب ٹکٹ دیکھنے والوں اور آنے والوں میں ہاتھا پائی ہوئی تھی، تو ہم شور وغل سن کر باہر نکلے تھے۔ ہم نے اپنے ایک دوست کو دیکھا تھا، جن کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، اور ایک حلقۂ احباب میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ہم نے آئندہ ارادوں کی نسبت پوچھا مگر وہ ٹال گئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

قصۂ مختصر یہ کہ بڑے بڑے سامان کئے گئے تھے، اور چونکہ "صلح" ہوچکی تھی اس لئے اب انتظامات خود انہی کے ہاتھوں انجام پارہے تھے، جو ۲۷ کی شام تک خود فریق جنگ" اور آزاد خیال" جماعت کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ اور دراصل افسوس بھی اسی کا ہے:۔

نیم بسمل اس نے گر چھوڑا، تو کچھ پروا نہیں   پر یہ غم ہے، اعتبار دوست قاتل اٹھ گیا

بہرحال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا، اور اس تماشے کا ایک ہی ایکٹ شروع ہوگیا سب سے پہلے ہمارے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی باہر نکلے اور رزولیوشن پیش کیا، وہ بیٹھے تو میجر (سید حسن) بلگرامی اٹھے اور تائید کی:۔

یکے بدزدی دل رفت و پردہ دار یکے!

اب نہ ۲۶ر کے محرک تھے اور نہ دید:۔

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار!
شب موم کرلیا، سحر آہن بنالیا!

۲۶ر کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا، ان کی تقریر اتنی پرجوش تھی کہ اس کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گذری اور ان کے کان میں کہا کہ خدارا ذرا لب ولہجہ نرم کیجیے۔ علی الخصوص، یہ بات ہمیں کچھ اچھی نظر نہیں آتی کہ سارا زور "جوش محمد" اور "مین اللہ" کے ضلع پر وہ صرف کر رہے تھے اور تقریر صرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر شخصی ارادت کرنے میں جاری تھی، حالانکہ بہتر تھا کہ بغیر تشخص و تعین کے وہ سب کچھ کہتے۔ ہم کو اعتراف ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس وقت قابل تعریف ضبط و تحمل سے کام لیا، اور اپنی تقریر میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، گو جلسہ ان کا مخالف تھا، مگر غصہ تو وہ شے ہے کہ موقع شناسی کی مہلت ہی کب دیتا ہے؟

لیکن آج ان کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے ان کے جوش کے انگارے سے اپنی انگیٹھیاں روشن کی تھیں، آج ان کو آغاز تقریر ہی سے جمائیاں آنے لگیں۔ پرسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے

آج انھوں نے چاہا کہ ٹھنڈے پانی ہی کو دائن گلاس میں بھر بھر کر تقسیم کر دیں۔ سوڈا بھی نہیں۔

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی لکھ کر اپنے قریب کے بیٹھے ہوئے احباب سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے، یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ بو اور ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں:۔

مرا اے مئے فروش آں بیخودی نیست
مگر در بادہ آبے کردہ باشی!

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لئے اعتماد کیجئے، لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی گو اچھی علامت ہو:

قسم سچی سہی، پھر بھی ضرورت کیا ہی کھانے کی

ہمارے دوست کو معلوم نہیں کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہدو پیمانات میں نہیں ہے، بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے۔ سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں، بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دنیا سے لی ہیں۔ اس نکتے کو خانخانان نے سمجھا تھا:۔

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست
نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ

قبل اس کے کہ کوئی کچھ کہے، خود انھی کے ڈیپوٹیشن کی تجویز کو "سادی چک بک" سے تعبیر کیا، اور پھر وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ کا سلسلہ شروع ہوا، کیا یہ اس کا ثبوت نہ تھا کہ خود ان کا ضمیر بھی اس وقت عالم اضطراب میں ہے، اس لئے خود ہی اپنے سے کھٹکتے ہیں، اور خود ہی جواب دیتے ہیں؟ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آج جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے، اس سے ہمارے دوست کو خود بھی حیا آرہی ہے:۔

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

غرضکہ دو دن کی فریقانہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا؟ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ لیجئے کہ خیر الامور اوسطھا کفر و اسلام، دونوں کو اختیار کیجئے۔ اہرمن اور یزدان دونوں کو رام کیجئے ایک ہی طرف کیوں جھکئے جب دونوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے؟ صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہئے جب بت کدے سے بھی رسم و راہ رہ سکے ایک ہاتھ میں زنار برہمن لیجئے اور دوسرے ہاتھ میں سبحہ زاہد یعنی ایک ہاتھ ایمان سے ملایئے اور دوسرا وقف مصافحہ نفاق یعنی ایک ہاتھ میں جام غلامی" دوسرے میں "سندان حریت"

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ، لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ

معشوق ما بشیوہ ہر کس موافق ست
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

نُؤمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ، وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (۴ : ۱۵)

بعض باتوں میں راہ ایمان اختیار کریں گے اور بعض میں راہ کفر. وہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں

حقیقت یہ ہے کہ اس "جمع اضداد" کی راہ نہایت مشکل ہے۔ ایک ہاتھ میں جام باطل پرستی رکھئے، اور دوسرے میں سندان حق پرستی، اور دونوں کو باہم زور زور سے ٹکرائیے، مگر شرط یہ ہے کہ باطل کے جام بلوریں میں بال تک نہ آئے، اور سندان حق پرستی بھی ہاتھ سے الگ نہ ہو۔

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اوروں کی خبر نہیں، مگر اپنی کمزوری کا تو ہمیں صاف صاف اعتراف ہے۔ اس شعبدہ بازانہ چابک دستی کی مشق کے لئے بڑی بڑی قابلیتوں کی ضرورت ہے، یہ مقامات عالیہ ہم تہی دستان کمال کو ابھی حاصل نہیں ہوئے۔

میجر صاحب کی تائید کے بعد میں نے تقریر کرنی چاہی، لیکن خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ وہ رزولیوشن کی نسبت ایک ترمیم قلمبند کر چکے ہیں، اس کو پیش کریں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریر کی اور دانشمندانہ طریقے سے بعض اختیارات مبہمہ کے محفوظ رکھنے کی ضرورت واضح کی۔ لیکن انتظامات مخفیہ سرگرم کار رہے۔ مخالفت کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔

اس عرصے میں میں کیا سوچ رہا تھا؟ تمام قیاسات کی تصدیق ہو چکی تھی اور معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد خیال پارٹی کی قوت کو شکست دینے کے لئے ایک عنصر مرکب سے الگ کر لیا گیا ہے۔ پھر اور جو جو تدبیریں ۲۶ء کے مدعیان آزادی اور ہنگامہ فرمایان حریت کو اپنے قابو میں لانے کے لئے کی گئی تھیں، وہ بھی کامیاب ہو گئی ہیں۔ ایک پورا جال ہے، جس میں سب کے پاؤں پھنس گئے ہیں۔ پھر کیا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر میں بھی خاموش ہو جاؤں؟

یہ ایک صفت کی ہر دلعزیزی اور احسان مندی تھی جو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہوتی تھی، کیونکہ تمام مدعیان آزادی و حق پرستی سر جھکا چکے تھے اور اب اس حق و باطل کے مرکب و معجون ہی کا نام، حق خالص، تھا پس آزاد خیالی اور حق پرستی پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے اور ہر دلعزیزی کی دولت ہاتھ آجاتی ہے حق بھی اپنے ہی حصے میں آتا ہے اور باطل کا دامن بھی نہیں چھوٹتا۔ پھر کیا مضائقہ اگر چند لمحے کی خاموشی سے مدتوں تک کام دینے والی کمائی پیدا کر لی جائے۔

یہ خیالات تھے جو اس موقع پر قدرتاً ہر دماغ میں گذر سکتے تھے۔ لیکن گو قوت کا ایک لمحہ کے لئے بھی دعویٰ نہیں تاہم ایسے ایسے نزغات شیطانیہ کے لئے تو الحمدللہ اپنے پہلو میں ایک قوت رکھتا ہوں۔ ہر دلعزیزی کی خواہش سب سے بڑا "شیطان" ہے جس کی ایک نگاہ گرم کے ساتھ ہی ہمتوں اور استقامتوں کی بڑی بڑی چٹانیں پانی ہو کر بہہ جاتی ہیں، لیکن جس دن میں نے اپنی پہلی آواز بلند کی اسی دن سے اپنے پاؤں کو راہ حق گوئی کی اس اولین زنجیر سے آزاد کر لیا اور استقامت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میرے عقیدے میں "ہر دلعزیز" کا زیادہ صحیح نام "منافق" ہے اور یہ محال قطعی ہے کہ ایک شخص "حق گو" بھی ہو اور پھر بزم ایمان و کفر، دونوں میں ہر دلعزیز ہو جو لوگ چلنا چاہتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے سامنے صرف دو ہی راہیں ہیں حق و باطل، کفر و ایمان، نور و ظلمت اور خدا پرستی و شیطان دوستی، انھی دو راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ یہ بالکل فضول کوشش ہے کہ دونوں میں سے کوئی نئی درمیانی راہ پیدا کی جاوے۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے ظاہر و باطن کو ایک رکھوں گا اور جو دل میں ہوگا اسی کو زبان کے حوالے کروں گا۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا جلد مجھے کسی سخت آزمائش میں ڈالے اور مجھے اپنے دل کی استقامت کے آزمانے کا موقع ملے۔

وَعَلَى اللّٰہِ، فلیتوکل المتوکلون۔

مجھ کو بعض صاحبوں نے روکا کہ اب مخالفت میں تقریر کرنا بے فائدہ ہے۔ نواب اسحاق خاں صاحب نے کہا کہ ایک بات پر اب سب متفق ہو گئے ہیں۔ مخالفت سے کیا فائدہ؟ لیکن درحقیقت ان بزرگوں کی غلطی تھی۔ مخالفت اس لئے نہیں کی جاتی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں، اور لوگ چیرز کا ہنگامہ بپا کر کے خیر مقدم کریں بلکہ صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیر کا حکم ہوتا ہے کہ ایسا کرو۔ یہ حکم بالکل اس سے بے پروا ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ کوئی سچی بات اس لئے نہیں ترک کر دی جا سکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ، پسچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو۔ البتہ یہ حالات و واردات اور ہیں جن کے سمجھنے سے

اپنے بزرگوں اور دوستوں کو ابھی عرصہ تک مجبور و معذور سمجھتا ہوں۔

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نئی ناصح
بدست آور رگ جان و نشتر را تماشا کن

جس چیز کو آپ لوگوں نے "ایمان" سمجھا ہے اپنے عقیدے میں وہی کفر ہے۔ حق کی پرستش کے لئے اولین شے قربانی ہے اور آپ کا دماغ ابھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ساری عمر نفس کی پرستش میں کٹی ہے، اب چند لمحوں کے اندر آپ کو خدا کیسے دکھلادوں؟ اپنی اپنی راہ ہے، اور اپنا اپنا مذہب:-

وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِب

آپ لوگ مجبور ہیں لیکن میری راہ میرے لئے چھوڑ دیجئے اور جہاں جا رہا ہوں جانے دیجئے۔ آج نہیں مگر کل بتلاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور مستقبل سے بڑھ کر کوئی جج نہیں۔ عنقریب کھل جائے گا کہ میں کس راہ پر تھا اور آپ کہاں جا رہے تھے اور وہ مقلب القلوب اپنے بندوں کے دلوں کو میرے لئے کھولتا ہے یا آپ کے لئے؟ البتہ جن دلوں کو خدا اپنے نور ہدایت کے لئے چن لیتا ہے ان میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ آج جس چیز کو دیکھتے ہیں تم کل دیکھو گے اسی معاملے کو دیکھو! جلسے میں صرف میں ہی ایک مجرم تھا جس نے مخالفت کی اور سب خاموش رہے۔ یا سرشاری نفاق سے ہی جھومتے رہے، لیکن آج سینکڑوں ہیں جو سر پیٹ رہے ہیں پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ ایک الٰہی نشانی

نہیں ہے جو حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کر رہی ہے اور بتلا رہی ہے کہ کس کی زبان اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اس کو کھلواتا ہے اور کس کے دل نفس کے قبضے میں ہے، جو انہیں ہلنے نہیں دیتا۔ پھر کیا کوئی آنکھ ہے جو دیکھے! کوئی کان ہے جو سنے! اور کوئی دماغ ہے جو سوچے؟

(۴)

رات اور زلف کا یہ افسانہ
قصہ کوتہ، بڑی کہانی ہے

صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس پر آزمائش و ابتلاء کے ایسے ایسے ہلاکت خیز وقت آئے ہیں جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل صداقت اپنی حامیوں کی کثرت و قلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پروا رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ تمہارے پاس اس لئے نہیں آتی کہ تمہاری محتاج ہے، بلکہ اس لئے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ اگر تم نے اپنے تئیں اہل ثابت نہیں کیا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے گی اور کسی اور مستقل دل کو اپنا نشیمن بنائے گی۔ اگر ۲۶۔ کی شام تک یونیورسٹی کے بارے میں ہمارا خیال حق تھا، تو ۲۷۔ کی شام کو (ڈنر) کے بعد اور دو بجے کی خلوت نیم شبی کی صبح کو وہ باطل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ۲۶۔ کی سہ پہر کو سچ سچ تھا اور صدہا آوازیں اس کا استقبال کرتی تھیں۔ تو ۲۸۔ کی صبح کو بھی وہ سچ تھا گو ایک آواز بھی اس کی حمایت کے لئے نہیں اٹھتی تھی۔ سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں

کی کثرت نہیں ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے۔ حق کی پرستش کے ایمان یکف مدعیوں کی استقامت اگر متزلزل ہے تو کیا مضائقہ؟ حق کی قوت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکتا حقیقی قوت اسی میں ہے، اور جن مبارک ہستیوں کو اس کے علم کے نیچے جگہ مل گئی ہے، انجام کار فتح یابی بھی انھی کے حصے میں آئے گی۔

وَتِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔

اور یہ آخر کی کامیابیوں کا گھران کے لئے ہے جو دنیا میں بڑائی اور پیشوائی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں، اور یاد رکھو کہ انجام کار اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں ڈوبتا ہے وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ "میں بھی بعینہ اسی طرح دیکھ رہا ہوں کہ سچائی غربت و کس مپرسی سے اٹھتی ہے، اور فتح و کامرانی کا علم بن کر لہراتی ہے۔ یہ میرا یقین اور میری بصیرت ہے۔ آپ کو نظر نہیں آتا تو میں دکھلا بھی نہیں سکتا۔

بہرحال میں نے مخالفت میں تقریر کی، اور نرم و خوشنما، پر اشمالی در زد جہتیں، اور معنی زہر آلود والفاظ شہد نما کی جگہ، صاف صاف لفظوں میں اس کارروائی کو ناقابل اعتماد تبلایا۔ یہ پیشتر سے معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مگر اظہار حق اور امر بالمعروف نتیجے کے خیال سے بے پروا ہے۔ وہ ایک فرضی ایمان اور محض تعبد الہٰی ہے، اور وقت کے بدلنے اور لوگوں

کے منہ پھیر لینے سے اس کا حکم نہیں پھر سکتا۔ میرے لئے اس قدر کافی ہے کہ آج جبکہ بعد از خرابی بسیار، بڑی بڑی آوازیں ڈیپوٹیشن کی مخالفت میں اٹھ رہی ہیں اور طرح طرح کے لقب اس کو دئے جا رہے ہیں۔ الحمدللہ کہ اپنے ضمیر اور ایمان سے شرمندہ نہیں ہوں اور دلوں کی عبرت اور نگاہوں کی بصیرت کے لئے یہ نشانی بس کرتی ہے کہ جس جگہ لوگوں کے قدم آج پہنچے ہیں، وہ عین اس وقت ہی میرے قدموں کے نیچے تھی، اور جو روشنی وقت گذر جانے کے بعد ان کو آج نظر آئی ہے، وہ عین وقت پر میں دنیا کو دکھلا رہا تھا۔ اس وقت تم نے نہیں دیکھا، اور اب اپنی آنکھوں کو مل رہے ہو۔ بہتر ہے کہ سروں کو پیٹو:
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اس قدر جوش و خروش، جمع و اجتماع، ادعا و شورش، اور ہنگامۂ رستخیز کے بعد یونیورسٹی کی قسمت پھر چند شخصوں کے ہاتھوں میں دے دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ بھی کہا تھا کہ قوم کو اب اپنی قسمت کے فیصلے کے لئے کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

اس آخری فقرے کی چبھن بہت سخت تھی۔ بڑے بڑے کرسیوں کے وزنی بوجھ (جن کے لئے قرآن کریم نے بہت اچھی تشبیہ دی ہے کہ "کانہم خشب مسندہ") لگے تلملا تلملا کر زانو بدلنے، اور مضطرب ہو ہو کے دیکھنے۔

وَرَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ	جن لوگوں کے دل مرض ضلالت سے
مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ	بیمار ہو رہے ہیں (اعلان حق کے وقت
نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْهِ مِنَ	تم دیکھو گے، کہ تمہاری طرف مضطرب

الْمَوْتِ ؕ (۴۷: ۲۹) | ہو ہو کے دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔

لیکن یہ بالکل بے فائدہ تھا:

مَنْ جَرَّبَ المجرب حلت بہ الندامۃ

یہاں محض اشخاص پر اعتماد کا سوال نہیں ہے بلکہ حالات پر اور اگر حالات پر ہمیں اعتماد نہیں تو یہ کوئی بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ اگر یونیورسٹی کی قسمت کا فیصلہ ان اشخاص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں تو باوجود ان کی تمام کمزوریوں کے پہلا شخص میں ہوتا جو کہتا کہ اعتماد کرو اور راضی نامہ داخل کرو۔ یہ کہنے میں ہمارا کوئی ہرج نہیں کہ جناب سر راجہ صاحب محمود آباد) پر ہمیں اعتماد ہے۔ کون کہتا ہے کہ شخصاً میجر سید حسن بلگرامی اور مسٹر محمد علی لائق اعتماد نہیں؟ یہ تو ہمیں اس وقت معلوم نہیں تھا کہ نواب وقار الملک بہادر ڈیپوٹیشن کی موجودہ صورت کے مجوزین میں شریک نہیں ہیں۔ ان کا نام ہی فہرست میں شامل تھا پھر قوم میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ نواب صاحب قبلہ لائق اعتماد نہیں؟ لیکن اصلی سوال یہ نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ حالات بھی قابل اعتماد ہیں جن میں یہ ڈیپوٹیشن مبتلا ہوگا؟ کیا اس فضائے آسمانی پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں کی ہوائیں حوصلوں اور عزموں کی چٹانوں کو سرمہ بنا کر اڑا دیتی ہیں۔

اور جب رایوں کی تبدیلی و تغیر کی ایسی مثالیں ہم کو دکھلائی جاتی ہیں

کہ ایک رات کے اندر جنگ کے خواستگار صلح کے آرزومند ہو جاتے ہیں اور جو چیز شام تک سیاہ تھی وہی صبح کو سفید بن جاتی ہے تو پھر ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر ہم اعتماد و عدم اعتماد کے سوال کو چھیڑتے ہیں؟ ہم تو اس قدر بے وقوف اور ہر فریب تازہ میں آجانے والے ہیں کہ چک بک کی کیا حقیقت ہے ہم نے تو ایک نگاہ ناز پر اپنے دلوں کو حوالے کر دیا ہے، لیکن آخر تا کجے؟ کب تک نئی نئی آزمائشوں میں ڈالے جائیں گے۔

ہم زمانے کی یہ حالت دیکھتے ہیں کہ چار آدمیوں کی مجلس میں بھی کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ جو کچھ دل میں ہے اس کو صاف صاف حوالۂ زبان کرے، پھر ہم کو تبلایا جائے کہ خواستگاران اعتماد میں وہ نفوس قدسیہ کون ہیں، جو گورنمنٹ ہاؤس میں اس استقامت کو ظاہر کریں گے، جس کی مثال ۸ ہر ستمبر کو قیصر باغ کی بارہ دری میں پیش کر سکے؟

ہم کو سب پر اعتماد ہے مگر اعتماد نہیں ہے اپنی بدبختی پر، اعتماد نہیں ہے اپنی محرومی پر، اعتماد نہیں ہے ان واقعات و حالات پر، جو اس ڈپوٹیشن کو پیش آئیں گے، اور جن کے سامنے نہ کسی کی استقامت چلے گی اور نہ دعویٰ عزم و آزادی۔ جماعت جتنی وسیع ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، اور جتنی کم ہوتی جائے گی، اتنی ہی رائے دینے والوں کے لئے دقتیں بڑھتی جائیں گی۔ آپ ایک جلسے میں کھڑے ہو کر اور ایک بہت بڑی جماعت کے صدائے اتفاق سے قوی ہمت ہو کر جس طرح گورنمنٹ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کیا حضور وائسرائے کے سامنے بھی اسی طرح کر سکتے ہیں؟ ہاں

کر سکتے ہیں مگر وہ ہستیاں اور ہیں، آپ نہیں ہیں:۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

جو لوگ جلسے میں شریک تھے ان کو یاد ہوگا کہ ہمارے آخری الفاظ کیا تھے؟ ہم نے کہا تھا:

" تم اس وقت نادانی اور غفلت کے ہاتھ بک گئے ہو مگر وہ وقت دور نہیں ہے جب "اعتماد" کی اس آخری آزمائش پر بھی تم کو متعصف ہونا پڑے گا ابھی وہ وقت نہیں آیا مگر تعصف ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ انشاءاللہ العزیز اس کا اصلی وقت بھی آ رہا ہے۔ اس وقت ہم پھر یک مرتبہ اپنے انھی الفاظ کو دوہرائیں گے۔ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ (اور میں نہیں جانتا کہ جس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا ابھی اس میں دیر ہے؟ ۲۱ : ۱۰۹)

جلسے میں اس وقت تین طرح کے لوگ تھے:۔ "مجلس نیم شبی" کے محرمان راز ان کے متبعین جو خود باریاب صحبت نہ تھے مگر ان کے نام احکام جاری ہو گئے تھے۔ اور کچھ عام لوگ جو اس ناگہانی انقلاب سے بالکل بے خبر تھے اور سادہ دل اور بے خبر حال ہونے کی وجہ سے کوئی آواز اور رائے نہیں رکھتے تھے۔

ان غریبوں کا عجیب حال تھا۔ ان میں بہت سے تعلیم یافتہ اور بہت سے سرگرم مدعیان آزادی حریت بھی تھے مگر یہ سب اس تیغ تیز سے زخمی ہوئے کہ مسٹر محمد علی کو تحریک کرتے اور میجر صاحب کو تائید کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن پہلے تک آزادی کا علم انھی کے ہاتھوں میں دیکھ چکے تھے۔

پس سمجھے کہ انھی حضرات کی طرف سے تحریک تائید ہو رہی ہے تو ضرور کوئی اپنے ہی مطلب کی بات ہوگی، گو ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

وہی کمبخت مذاق تقلید جو کل تک پرانے لیڈروں کی اندھا دھند اتباع کی صورت میں خانماں سوز عقل و دانش تھا، آج آزادی کے عہد تازہ میں نئے لوگوں کے اتباع کی صورت میں فہم و دراست کی گردن کا طوق بنا۔ درد و ندامت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابنائے عصر کی غلامی بھی مقلدانہ تھی، اور اب آزادی بھی مقلدانہ ہے۔ کچھ حصہ نئے دور کا گذر جائے، اور مدتوں کے گرفتار تقلید دماغ (جو بالکل شل اور معطل ہو گئے ہیں) کچھ کچھ فکر و اجتہاد کے عادی ہو جائیں، تو پھر شاید ہر شخص اپنی سمجھ سے ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

اب قدیم و جدید، اور مستبدین و احرار کی "متحدہ سازش" سخت بدحواس ہوئی کہ کہیں بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔ ہر طرف سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ	رازدارانہ سرگوشیاں شیطان کے
لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وسوسے اندازی سے ہوتی ہیں، تاکہ
وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا	مسلمان اس کی وجہ سے آزردہ خاطر
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى	ہوں، حالانکہ بغیر مشیت الٰہی کے یہ
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	سرگوشیاں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا
(۵۸ : ۱۰)	سکتیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہر طرف

سے ہٹ کر صرف اللہ ہی پر اعتماد کریں۔

معاً خواجہ غلام الثقلین صاحب کو بھی ڈیپوٹیشن میں شریک کر لیا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے اسٹیج کے "اقتضائے مغرب" سے "مشرق ادنیٰ" کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہاں قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا اور منتیں کیں کہ مان جاؤ کیا کرتا؟ مجبوراً ماننا ہی پڑا:-

اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّةً (۵۸: ۱۶) — انھوں نے بچاؤ کے لئے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔

گو مے ہے تند و تلخ، یہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچا، تو میں نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ اور زیادہ مخالفت کروں۔ عرصے کے بعد کانفرنس میں آیا تھا۔ لوگ کہتے کہ اسی نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔

بہر حال یارانِ طریقت نے خواجہ صاحب کو بھی چپ کرا ہی دیا:-

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا، نگہ التفات ہے

اب خواجہ صاحب سے کیا گلہ شکوہ کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ مجھے قسموں نے فرصت ہی نہ دی:-

نازسے، عشوہ سے، غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

خواجہ صاحب نے بھی دیکھا کہ کسی کی منتیں مفت میں ہاتھ آتی ہیں، یہ

ضد اور ہٹ کا موقع نہیں:۔

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے"

لے دے کے ایک خواجہ صاحب ہمارے ساتھ اٹھے تھے۔ ان کو بھی ہمارے دوست اسٹیج کے پیچھے لے گئے۔ اب بے چارے (میر حسن) کو بھی یہی شکایت تھی:۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں؟

ہم تو اس وقت تقریر کر رہے تھے کیسے معلوم کہ اسٹیج کے گوشے میں کیا ہو رہا ہے ورنہ خواجہ صاحب کو پہلے ہی خبردار کر دیتے:

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل، وہ دشمن جاں مہرباں ہے اب

خیر بہتر ہے آپ لوگ اپنے سر مفت میں کیوں الزام لیں؟ صلح ہوتی ہو تو جنگ کیوں کریں۔ الزاموں اور مخالفتوں کے لئے تو ایک زیاں پسند نفع فراموش محروم عقل و دانش دماغ مجھ دیوانے ہی کا بنا ہے اور کوئی کیوں بدنام ہونے لگا:۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل سے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

دنیا کو یہ عقل مندی اور دانش اور مجھ کو اپنا جنون، نفع دشمنی مبارک

رہے، میں دعا مانگتا ہوں:

وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ اٰمِيْنًا!

(کامل پاشا) نے جب اپنے اعمال مخفیہ کو انجام دینا چاہا تو چاروں طرف نظر ڈالی۔ فوجی قوت صلح کی مخالف تھی۔ اس نے سوچا کہ بغیر (ناظم پاشا) کے ملائے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ پہلے ناظم صلح کے اشد شدید مخالف تھے اور چٹلجا سے تار پر تار دیتے تھے۔ لیکن جب ۲۲ جنوری کو (سرائے درملہ باغچہ) میں "قومی مجلس" منعقد ہوئی تو اس تماشے کا ہر ایکٹر اپنے پارٹ کی مشق کر آیا تھا ناظم پاشا سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور کہا کہ جنگ سے کیا فائدہ بہتری اس میں ہے کہ صلح کرلی جائے۔ اب کامل پاشا خاموش تھا اس لئے کہ ناظم کے اندر سے اسی کی صدا نکل رہی تھی اس کو لب ہلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

یہاں بھی آج "قومی مجلس" تھی اور صلح کی سعی و آرزو نے شدید نہ تو سر راجہ صاحب کو لب ہلانے کی ضرورت ہوئی نہ ان کے اعوان و انصار کو، صرف ایک ہمارے دوست ہی کافی تھے:۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

غرضکہ کہاں تک اس افسانے کو طول دیجئے۔ زلف یار کی آج تک کون پیمائش کر سکا ہے۔

ماجرا ہا ست باآں زلف فسوں ساز مرا

بالآخر وہی ہوا جس کا ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ

انتظام کیا گیا تھا:۔

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

مسٹر ممتاز حسن بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے بولنا چاہا، مگر اب کون بولنے دیتا ہے۔ یاران کار فرما پر ایک ایک منٹ ایک ایک برس کا گذر رہا تھا۔ جلدی تھی کہ نہیں معلوم کن کن اعمال مخفیہ اور وظائف نصف اللیل ، کے بعد اپنا بخت خفتہ بیدار ہوا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ان کی آنکھ کھلے اور ادھر ان کی قسمت پھر چادر منہ پر ڈال لے۔

بہ ہزار مشکل ان کو نہایت بنا تلا وقت دیا گیا، لیکن ادھر ایک لفظ منہ سے نکلتا تھا ادھر گھڑی دکھلائی جاتی تھی کہ وقت ہو گیا!

اس کی محفل کی دیکھنا تہذیب
بات کا انتظام ہوتا ہے!

تقریر کیا کرتے انھیں وقت کی حساب فہمی سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی مجبوراً خاموش ہو گئے۔

جن لوگوں کی کشت امید میں ۲۶۔ کی شام تک خاک اڑ رہی تھی آج دیکھتے تھے تو گھٹائیں اُمڈی آ رہی ہیں خوف تھا کہ یہاں کی فضا کا کیا ٹھکانا؟ کہیں پھر موسم بدل نہ جائے۔ یکا یک غل مچا کہ رزولیوشن پاس کر دو!

سر راجہ صاحب نے حضار مجلس سے پوچھا کہ منظور ہے؟۔

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی

یہاں خود ہی دست سوال تھا اور خود ہی زبان جواب:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ اگر حلقہ نیم شبی کا بس چلتا تو اس سوال کا جواب زبان کی جگہ دل کے ٹکڑوں کی پیش کش سے دیتے کہ دل و جان سے منظور ہے کہیں خدا کے لئے پاس بھی کیجیے:

ساقی مے دے کہ اہلِ مجلس

پانی پانی پکارتے ہیں!

یکایک شور اٹھا کہ منظور منظور منظور!!! اسٹیج اور اس کے اردگرد جو حلقہ تھا وہی منظوری لینے والا تھا اور وہی منظوری دینے والا، نہ سوال میں دیر لگی اور نہ جواب میں۔

رزولیوشن کے پاس کردینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ جن نوجوانوں نے پرسوں اپنی گلابازی سرگرم تقریروں میں دکھلائی تھی، آج ان کی گرج اس ہنگامے کے بپا کرنے میں کام آگئی چیختے چیختے گلا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا، مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا آواز اگلتے اگلتے منہ دکھ جاتے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلغاری محاصرہ" کی پلٹنیں اس بیکاری سے کچھ اکتا سی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹے کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لئے بارہ دری کے اسٹیج کو "بارمسٹن سرکس" کا تماشا گاہ فرض کرلیا اور لگے بے تکان قلابازیاں کھانے۔

دل از تمکیں شود بے ذوق زنہار
گہے طفلی شود مستانہ می رقص !

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں، اور پاؤں کو اضطراب رقص سے قرار نہیں۔ منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پوچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدان رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوش تواجد میں گردش رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی، اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا!

یہ ایک رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا۔ اگر (سرہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پرجوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔

لیکن اس عجیب الخلقت تماشے کا ایک خاص منظر تو رہ ہی گیا۔

جونہی رزولیوشن کے پاس کرنے کا غل مچا ہم نے دیکھا کہ معاً سر راجہ صاحب محمود آباد اپنی کرسی سے مضطربانہ اٹھے اور نواب وقار الملک بہادر کے ہاتھوں کو بے اختیارانہ چوم لینا چاہا۔ نواب صاحب قبلہ کی جو سچی عظمت

قوم کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اگر راجہ صاحب ان کے قدم بھی چوم لیتے تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن رزدلیوشن کے پاس کرنے کے ساتھ ہی اس مضطربانہ اور بیخودانہ تعظیم کا ہم مطلب نہ سمجھے کہ دست بوسی کی قیمت نقد کے لئے کوئی متاع نقد بھی ہونی چاہیئے۔ مگر اب خود نواب صاحب قبلہ کی تحریر گرامی سے یہ عقدہ حل ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ واقعی اس وقت راجہ صاحب اپنی بے اختیارانہ اظہار ممنونیت میں حق بجانب تھے۔

یاد ہوگا کہ نواب صاحب قبلہ نے اپنی تحریر میں ایک جگہ ارقام فرمایا ہے "بعض معزز دوستوں نے پرائیویٹ طور پر مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ رزولیوشن کی تائید کریں گے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے مرتبہ مسودہ اور اس میں اختلاف ہے۔ اس لئے میں ترمیم پیش کروں گا۔ اس پر مجھ سے بہت اصرار کیا گیا کہ میں ایسا نہ کروں ورنہ جلسے میں بہت گڑبڑ ہو جائے گی مسٹر محمد علی نے رزولیوشن پیش کرتے ہوئے کہا کہ رات کو بڑی رات گئے تک اس رزولیوشن کے متعلق مشورہ ہوتا رہا اور فلاں فلاں صاحبوں کے اتفاق سے (جن میں میرا نام بھی انہوں نے لیا) اس کا مسودہ مرتب ہوا ہے (حالانکہ یہ صحیح نہ تھا کیونکہ نواب صاحب کے مجلس سے چلے آنے کے بعد بعض لوگوں کو موٹر کاریں بھیج کر بلوایا گیا اور خود ہی اس رزولیوشن کا مسودہ اور ممبران ڈیپوٹیشن کی فہرست مرتب کی۔ نواب صاحب قبلہ کے سامنے یہ بات قرار پائی تھی کہ صبح کو خود ایک مسودۂ رزولیوشن مرتب کر کے پیش کریں چنانچہ بقیہ رات جاگ کر اور سخت تکلیف و مشقت برداشت کر کے انھوں نے

مرتب فرمایا لیکن صبح کو کسی نے پوچھا تک نہیں کہ وہ مسودہ کہاں ہے۔!

اس پر میں نے ان معزز دوست کو جنھوں نے خاموش رہنے کی تاکید کی تھی، توجہ دلائی کہ اس رزولیوشن کی ذمہ داری اب میرے اوپر بھی آتی ہے مگر انھوں نے اس وقت سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو سخت مشکل میں پایا۔ جلسے میں ایک طرف تو میرا نام مجوزین فہرست میں خلاف واقعہ لیا گیا اور جلسے کو دھوکہ دیا گیا دوسری طرف اس بات کی کوشش کی گئی کہ میں جلسے میں بالکل سکوت اختیار کروں۔

اب اس "عقدۂ دست بوسی" کا حل بالکل سامنے ہے۔ یہ مضطربانہ اظہار تعظیم و تکریم اس لئے تھا کہ اگر آپ خاموش نہ رہتے تو یہ کشتی طوفانی کیونکر ساحل مراد تک پہنچتی۔ حریفان خلوت نے صحبت نیم شبی کی مجلس خاص کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ صبح کی مجلس عام کو بھی سرشاری و بیخودی سے محروم نہ رکھا۔ کیونکہ بارہ دری سے نکل کر جو کچھ گذری اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں لے سکتا اور کیوں لے؟ لیکن اس میں شک نہیں کہ بارہ دری کے اندر تو سب ہی مست تھے:۔

بیخود اس دور میں ہیں سب حاتم
ان دنوں کیا شراب سستی ہے؟

لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی مآب دوست نے پلائی تو ضرور کوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظروں کے لئے ولولہ انگیز تھا، لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا،

کیونکہ ہم نے ۲۸ رہی کو دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہوگئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔ بارہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیانِ آزادی ملے، جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا، لیکن وہ رزو لیوشن کا مطلب بھی نہ بتلا سکے! جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے بھی تو رقص مغلوبہ میں حصہ لیا تھا تو یکایک ان کے سر میں خارش شروع ہوگئی۔ حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں بلکہ پیشانی تھی۔

گیا ہو سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

عالم اسلام

۱- عظیم الشان ادرنہ	الہلال ۲۱ رمئی ۱۹۱۳ء
۲- سقوط ادرنہ	" ۹ راپریل "
۳- تسخیر ادرنہ	" "
۴- طلل ادرنہ	" ۱۴ رمئی ۱۹۱۳ء

عظیم الشان ادرنہ

مختصر حالات

نام اور حدود اربعہ

رومیلی (یوروپین ٹرکی) میں ایک صوبہ ہے جس کی حد بندی شمال کی طرف سے اینہ طاغ اور بلقان، مشرق کی طرف سے بحرِ اسود، جنوب کی طرف سے آستانہ علیہ، بحیرہ مرمرہ، درِ دانیال، جزائر جبیل، اور مغرب کی طرف سے رستیو طاغ کرتا ہے۔ رقبہ ۶۲۷۸۸ کیلومیٹر ہے۔ ۳۶ ضلعے اور قسمتیں ہیں۔ قسمتوں کے نام یہ ہیں

(۱) ادرنہ (۲) فلبۃ (۳) اسلمہ (۴) تکفور طاغ (۵) گلی پولی۔

کل آبادی ۲۵۳،۰۵۹ ہے۔ صوبے کا دار الحکومت ادرنہ ہے۔ پہلے اس صوبہ کا نام ترافت (تھرافٹ) تھا، مگر اب یہ اپنے دار الحکومت کے نام سے موسوم ہے۔

مناظر طبیعی

یورپ میں یوروپین ٹرکی، اور یوروپین ٹرکی میں ادرنہ اُن مقامات میں سے ہے جن کے لیے قدرت نے کشادہ دستی کو زیادہ کام فرمایا ہے (دامنہائے کوہ (جن

اس صوبہ میں کمی نہیں۔ لذیذ میووں، عطر بیز پھولوں، اور خوش منظر درختوں کے کنج، اور نظر کش و باصرہ افزا مرغزاروں سے معمور ہیں۔ پہاڑوں سے گرنے والے لطف انگیز و نغمہ طراز آبشاروں کے علاوہ شیریں، خوشگوار، اور شفاف پانی کی نہروں کا ایک روپہلی جال ہے جو تمام صوبے میں بچھا ہوا ہے، اور ہر ہر گوشہ میں سیراب و شاداب کرتا رہتا ہے۔ ہوا بھی معتدل مگر لطیف و خوشگوار ہے۔ مختصراً یہ کہ یہاں کے مناظر طبیعی بے حد صحت پرور، فرحت انگیز اور لطف آگیں ہیں۔

پیداوار

خاک اور نہ جس طرح فرحت پرور اور نظر نواز ہے، اسی طرح مایہ دار اور زرریز بھی ہے۔ نباتات میں روئی، انیون، بادام، فندق، کاپی، سیب، ناشپاتی خربزہ، اور جمادات میں پشمینہ، لوہا اور سنگ مرمر برآمد ہوتا ہے۔ ان خداداد سرچشمہائے دولت کے علاوہ یہاں تمول کا وہ ذریعہ بھی ہے جو گنج عالم کی کلید اور قدرت کی فیاضیوں سے محروم ممالک کا مدار زندگی ہے۔ میری مراد اس سے صنعت ہے۔ اصناف صنعت میں سے یہاں پشمینہ و پنبہ بافی اور اسلحہ سازی زیادہ شائع ہیں تینوں قسم کے کارخانوں کی ایک تعداد موجود ہے جو کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہاں کی مصنوعات میں سے جانمازیں، پردے اور عبائیں اپنی گلکاری، خوش رنگی، اور پائداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ غرض کہ اور نہ ایک شاداب، سیر حاصل، اور مایہ دار صوبہ ہے، اور اسی لیے یورپین ٹرکی میں قسطنطنیہ کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ شاید اب کہنا چاہیے کہ "تھا" اور نہ بلحاظ دارالحکومت ہونے، نیز طبیعی اور صناعی دونوں حیثیتوں سے اس صوبہ کا واسطہ

الفتہ ہے۔ یہ قسطنطنیہ سے شمال مغرب ۱۳۰ میل دور اس سنگم پر واقع ہے جہاں مریج، طنجہ، اور اردا، تین نہریں ہم آغوش ہو کر ایک نظر زیبا عریض سطح آب پیدا کرتی ہیں۔ شہر کے گرد ایک پرانی شہر پناہ ہے جس سے سنگم کی موجیں ٹکراتی ہیں۔ تمام شہر دلکش باغوں، اسلامی اور غیر اسلامی تاریخی عمارتوں سے معمور ہے، جو زبان خاموشی سے اسلاف کی جنگ آرائی، نفاست دوستی، رفعت پسندی اور شکوہ نمائی کی داستان سناتی ہیں۔ یہیں وہ قصر بلند ہے جس کو (اسکی سرائے) کہتے ہیں۔

اسی قصر میں بیٹھ کے عثمانی سلاطین سنہ ۷۶۸ ہجری میں "باب مسیحیت" پر جسے سب سے پہلے ایک صحابی نے اپنی شمشیر جہاد سے کھٹکھٹایا تھا، جانبازانہ و مسلسل حملے کرتے رہے یہاں تک کہ سنہ ۸۰۰ ہجری میں وہ کھل گیا، اور اسلام کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔

شہر ادرنہ میں چالیس سے زائد مساجد ہیں، جن میں نو خاص سلاطین عثمانیہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔

جامع سلیم

ان مساجد میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر جامع سلیم ہے جیسا کہ اُس کے نام سے معلوم ہوتا ہے۔ جامع سلیم کا بانی سلطان سلیم ثانی تھا، جو خاندان عثمانیہ کا گیارھواں تاجدار تھا اور سنہ ۹۷۴ھ سے سنہ ۹۸۲ھ تک حکمراں رہا۔ اس مسجد کی رفعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ جامع ایا صوفیہ سے ۲۰ قدم [illegible] ہے۔ اس میں ایک عظیم الشان گنبد ہے جو سنگ سماق کے دو کھمبوں پر رکھا ہوا ہے۔ چار مینار ہیں، ہر منارے میں ایک زینہ ہے جس سے موذن سر مادنہ تک جاتا ہے۔ صحن کے تین گوشوں میں قبے ہیں، جو مسجد کی عظمت و جلال کو افزوں تر کرتے ہیں۔

اپنی عظمت، استحکام، اور خوشنمائی کے لحاظ سے جامع سلیم کا شمار عثمانی فن تعمیر و تمدن کے بہترین نمونوں میں ہے۔

ان مساجد کے علاوہ دو بہت بڑے بازار ہیں، جن میں سے خوشنما تر وہ بازار ہے، جس کو علی پاشا کہتے ہیں۔ یہ اس قدر طویل ہے کہ ایک متوسط رفتار آدمی ۱۵ منٹ سے کم میں پورے بازار کا چکر نہیں لگا سکتا۔

دیگر عمارات

ادرنہ میں بڑے فندق (ہوٹل) ۲۵ ہیں۔ نہر طنجہ پر ایک پل بھی ہے۔ ان عمارتوں کے علاوہ متعدد حمام، مدارس، قہوہ خانے اور شفا خانے ہیں۔ ایک مطبع بھی ہے۔ سرکاری پارچہ بافی کے کئی کارخانے ہیں، جن میں ریشمی اور اونی کپڑے بُنے جاتے ہیں۔

گلشن آباد عالم!

زمین نہایت درجہ سرسبز و زرخیز ہے، باغوں کی یہ کثرت ہے کہ ادرنہ گلشن آباد ہو رہا ہے۔ صرف نہر مرتیج کے ساحل پر ۵۰۰ باغ ہیں۔ ان میں سے اکثر صرف گلاب کے لیے وقف ہیں۔ گلاب کی اس درجہ کثرت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں عرق کشی کے کئی کارخانے ہیں، جن میں فقط عرق گلاب کشید کیا جاتا ہے، اور اس کے لیے ادرنہ مشہور ہے۔ یہاں کا عطر روح گلاب تمام دنیا میں اوّل درجہ کا تسلیم کیا جاتا ہے

آبادی

آبادی ۱۵۰۰۰ ہے جس میں ایک ثلث بلغاری و یونانی، اور بقیہ دو ثلث

میں یہود، ترک، ارمنی اور عام فرنگی ہیں۔

قدیم تاریخی معرکے۔

فن تاریخ کا یہ ایک راز آشکار ہے کہ جن ممالک پر قدرت کا ابر کرم زیادہ برستا ہے، اُن میں خون کی بارش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صوبہ ادرنہ پر قدرت کی اس درجہ کرم گستری کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آماجگاہ جنگ ہوتا۔ رومیوں کے زمانہ سے اس وقت تک صدہا ہولناک جنگیں ہوئیں، اور بارہا خون کے سیلاب، بکھرے ہوئے اعضا، اور خون آلود انسانی پیکروں سے ادرنہ کے دلکش مرغزاروں کو ایک ایسا لالہ گوں نقش زار بنا دیا جسے دیکھ کے دل فگار اور آنکھیں خونبار ہوتی تھیں ۳۲۴ء میں قسطنطین اور لیکینوس میں ایک خونریز معرکہ ہوا، جس میں ہزارہا انسان کام آئے ۳۷۸ء میں پھر میدانِ کارزار گرم ہوا۔ فریقینِ جنگ گاتھ اور شاہنشاہ فالنس تھے۔ میدان گاتھ کے ہاتھ رہا۔ ۳۷۰ء میں پھر آتشِ جنگ روشن ہوئی۔ سلافی اور بیزنطینی سپاہ معرکہ آرا بھی ہوئی لیکن بیزنطینی فوج کو شکست ہوئی ۵۵ء میں بلغاریوں نے فوج کشی کی اور بزور شمشیر شہر میں داخل ہو گئے ۱۱۸۹ء میں انگریز داخل ہوئے مگر چلے گئے ۱۲۰۵ء میں بورڈین نے حملہ کیا، اس وقت شہر ادرنہ بلغاریوں کے قبضہ میں تھا۔ میدانِ کارزار آراستہ ہوا، مگر حملہ آور فوج نے مدافع فوج کو شکست دی، اور بادشاہ کو قید کر لیا۔ ۱۳۶۱ء میں خاندان عثمانیہ کے تیسرے تاجدار سلطان مراد اوّل نے اس کو فتح کیا اور وہ مشہور محل شاہی بنایا جس کا ذکر عمارات کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ ۱۲۴۵ھ میں روسی فوج داخل ہوئی مگر بعد کو

معاہدہ اور نامہ کے بموجب روسیوں نے شہر کو خالی کر دیا تھا۔
اب اس کا حسرت انگیز حال سامنے اور مستقبل مجہول ہے!

سقوط ادرنہ

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

ہمت نہ ہارو اور نہ اس شکست کی خبر سن کر غمگین و دل شکستہ ہو۔ یقین کرو کہ اگر تم سچے مومن ہو، تو آخر کار تمہارا ہی بول بالا ہے۔ اگر تم کو اس لڑائی میں سخت زخم لگے، تو ہمت نہ ہارو کہ طرف ثانی کی قوت بھی اسی طرح مجروح ہو چکی ہے اور یہ وقت کے نتائج و حوادث ہیں جو نوبت بہ نوبت سب لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔

أَيَّتُهَا النَّفْسُ أَجْمِلِي جَزَعًا[1]
فَإِنَّ مَا تَحْذَرِينَ قَدْ وَقَعَا

بالآخر ادریانوپل فتح ہو گیا اور واقعات و حوادث کے آگے انسانی سعی جیسی کہ ہمیشہ ناکام رہی ہے اس معرکہ میں بھی ناکام رہی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

[1] اوس بن حجر کا مشہور شعر ہے یعنی اے نفس محزون! اب رونا دھونا موقوف کر کیونکہ جس حادثہ کے خیال سے ڈرتا تھا، وہ تو ہو چکا۔

بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میرؔ　　　بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۰:۷۶)

صبح تمنا اور شام حسرت

اس اُمید آباد عالم میں ہر لمحہ اور ہر آن کتنی اُمیدیں ہیں جو پیدا ہوتی ہیں اور کتنے ولولے ہیں جو اُٹھتے ہیں؟ پھر اُن میں کتنے ہیں جن کے نصیب میں فیروزمندی وکامرانی ہے، اور کتنے ہیں جن کے لیے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں! بیکس انسان جو آرزوؤں کا بندہ اور حسرتوں کے خمیر کا پتلا ہے شاید صرف اس لیے بنایا گیا ہے کہ نصف عمر اُمیدوں کے پالنے میں صرف کر دے۔ اور بقیہ نصف نامرادی کے ماتم میں کاٹ دے۔ یحییٰ برمکی نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان سے پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے تو پھر ایک ایک ٹکڑے کو اُٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اُسی طرف پھینکنے لگتا ہے۔ کیا انسانی ہستی کی پوری تاریخ اس مثال میں پوشیدہ نہ تھی؟ ہماری زندگیاں جن کے ہنگامۂ حیات سے کارگاہِ عالم میں شورش و کشمکش کے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، غور کیجیے تو ایک تارِ عنکبوت، اور حسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے سے زیادہ کیا ہستی رکھتی ہیں؟ ساری عمر دو ہی کاموں میں بسر کر دیتے ہیں، یا صحرائے دجلہ کے اعرابی کی طرح صبح تمنا میں اُمیدوں کے سنگریزے جمع کرتے ہیں، یا پھر شام نامرادی میں جہاں سے لائے تھے، وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے مدفون ہو جائیں

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

کارسازِ قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں! کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکسترِ حسرت کی، دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا، اور انسان نام رکھ کر اس ہنگامۂ زار ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی امید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہی کبھی ناامیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہی۔ کبھی دلولوں کی بہاریں زمزمہ ساز نغمۂ انبساط ہوتا ہی اور کبھی حسرت و افسوس کی خزاں میں امیدوں کے پژمردہ پتوں کو گنتا ہی۔ کبھی ہنستا ہی اور کبھی روتا ہی۔ کبھی رقص نشاط ہی اور کبھی سینۂ ماتم، ایک ہاتھ سے جمع کرتا ہی اور دوسرے سے کھوتا ہی۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پس اے ساکنانِ غفلت آبادِ ہستی! وائے رہروانِ سفرِ مدہوشی و فراموشی! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہی تو پھر اور کیا ہی؟ اور اے نیرنگ آرائے تماشا گاہِ عالم! کیا یہ ہنگامۂ حیات، یہ شورشِ زندگی، یہ رستخیز کشاکشِ ہستی تو نے صرف اتنے ہی کے لیے بنائی ہی؟

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

رَبَّنَا! مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

نہیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطراب و التہاب کا باعث ہوا ہوگا؟ مگر سچ یہ ہی کہ اپنے کان ہی بہرے ہیں ورنہ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہی

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۲: ۱۰۶)

یہ سچ ہے کہ مصائب ناکامی کا ہجوم انسان کے دل میں ایسے خیالات پیدا کر دیتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صنعت گاہ عالم کا یہ ساز و سامان صرف اتنے ہی کے لیے نہیں ہو سکتا۔ وہ عالم انسانیت کبریٰ جو تاج خلافت الٰہی سر پر اور خلعت کرامت (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ) اپنے دوش عظمت پر رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ صرف امیدوں کے پالنے اور پھر اُن کی موت و احتضار کا تماشا دیکھنے کے لیے بنایا گیا ہو؟ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ؟

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳: ۱۸۹)

جو ارباب فکر و حکمت اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں ذکر کرتے ہیں، اور آسمان اور زمین کے ملکوت و آثار قدرت پر تفکر و تدبر کی نظر ڈالتے ہیں، ان کی زبانوں سے تو یہ عالم صنعت دیکھ کر بے اختیار صدا نکل جاتی ہے کہ خدایا یہ تمام کارگاہِ صنعت تو نے بیکار و عبث نہیں پیدا کی ہے۔

بہار و خزاں اور اُمید و بیم

اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجیے گا، جذبات انسانی کی تحلیل و تفریق کے آخری عناصر یہی دو چیزیں امید و حسرت نظر آئینگی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے

یا آئندہ کی اُمید ہی اور یا رفتہ پر حسرت، البتہ یہ ضرور ہی کہ اُمید و یاس کی تقسیم کو
صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجیے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں
کی تاریخ پوشیدہ ہی۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے
آتے ہیں اور اپنی اپنی آمد کے متضاد و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح اُمید
اور حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیے، جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور
وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہی جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہی۔ بعض
قومیں ہیں جن کے حصہ میں اُمید کی بہار آئی ہی اور بعض ہیں جو اب صرف یاس و
حسرت کے خزاں ہی کے لیے رہ گئے ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا
ہی اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں
اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہی یہی حال
ان قوموں کا ہوتا ہی جو اپنے دورِ اُمید سے گذرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لیے ایک
بہشتِ اُمید بنجاتی ہی اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لیے ایک ترانۂ اُمید
کا کام دیتی ہی۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر گوشہ اُمیدوں اور ولولوں کا آشیانہ
نظر آتا ہی اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس اُمید کی مسکراہٹ سے
خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زار ہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہی
اور نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کا میوں
سے ہیں جب تک آپ کے دل کے طاقِ مخفی میں اُمید کا چراغ روشن ہی اس
وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصر
نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا، تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر

درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجیے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور آپ کے سب لیے ظلمت سرائے تاریک ہے۔

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے اس لیے جہاں جاتے ہیں اقبال و کامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے چونکہ ان کے دل کے اندر سلطان اُمید فتحیاب ہوتا ہے، اس لیے زمین کے اوپر بھی نامرادی و ناکامی کی صفوں پر فتحیاب ہوتے ہیں۔ جس ہاتھ میں اُمید کا علم ہو پھر دنیا کی کوئی قوت اس ہاتھ کو زیر نہیں کرسکتی۔ ان کی اُمید حسرتِ آرزو نہیں ہوتی جو محض ناکامی و نامرادی کے ماتم کے لیے ہے۔ بلکہ کامیابیوں کا ایک پیغامِ دعوت ہے جو دل میں اُمید بن کر اور دل کے باہر عیش و مراد کی کامرانی و فیروزمندی کی صورت بن کر جلوہ آرا ہوتی ہے۔

لیکن اسی سطحِ ارضی کے اوپر جو اُمید کی کام بخشیوں سے خوش نصیب قوموں کے لیے عیش مراد کا ایک چمن زار نشاط ہے وہ بدنصیب قومیں بھی بستی ہیں جن کے دامنِ حیات میں اُمید و یاس کی بخشش کے وقت، اُمید کے پھولوں کی جگہ صرف نا اُمیدی کے کانٹے ہی آئے ہیں جو خزاں کے افسردہ و افسردہ کن موسم کی طرح دنیا میں صرف اس لیے زندہ رہتے ہیں کہ بہار گذشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنے درخت اُمید کی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں، وہ دنیا جو اوروں کے لیے اپنی ہر صدا میں ایک پیغام اُمید رکھتی ہے، ان کے لیے یکسر ماتم کدۂ یاس بن جاتی ہے۔ دل جب مایوس ہو تو دنیا کی ہر چیز میں مایوسی ہے۔ ان کے دلوں میں اُمید کا چراغ بجھ جاتا ہے

ہو دل کے باہر بھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے وہ وسیع صحرا جن پر قدرت نے طرح طرح کی نباتاتی نعمتوں کا دسترخوان چن دیا ہے، وہ خوشنما اور عظیم الشان آبادیاں، جن کو انسانی اجتماع اور مدنی محنتوں نے زمین کے عیش و نشاط کا بہشت بنا دیا ہے وہ عظیم الشان اور بے کنار سمندر جن کی حکمرانی کی طاقت حاصل کرنے کے بعد پھر خشکی کے ٹکڑوں پر حکمرانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غرضکہ اس زمین اور زمین پر نظر آنے والی تمام چیزیں اُن سے اس طرح مُنہ پھیر لیتی ہیں گویا وہ اس زمین کے فرزند ہی نہیں ہیں۔ بلکہ بڑی بڑی آبادیاں قوموں اور جماعتوں کی فاتحانہ اُمنگوں کا جولانگاہ ہوتی ہیں تو ان بدنصیبوں کے لیے صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی کوئی گوشۂ عافیت نہیں ہوتا صحراؤں کی فضائیت، ہوا کی سنسناہٹ اور دریاؤں کی صدائے روانی اوروں کے لیے پیام اُمید ہوتی ہے، مگر اُن کے کانوں میں ان سب سے نامرادی و فنا کی صدائیں اُٹھ اُٹھ کر طعنہ زن ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اگر بہار و خزاں، اُمید و یاس، شادی و غم، نغمہ و نوحہ، خندہ و گریہ، اور فنا و بقا دو ہی چیزیں ہیں جن کی زمین کے بسنے والوں میں بخشش ہوئی ہے، تو مختصر یوں سمجھ لیجیے کہ پہلی قوموں کو بہار و اُمید اور شادی و نشاط کا حصہ ملا ہے، اور دوسروں کو یکسر یاس و حزن، نوحہ و ماتم اور گریہ و فغاں کا:

ما خانہ رسیدگان ظلمیم ۔۔۔ پیغام خوش از دیار ما نیست

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

لیکن یہ حالات و نتائج کا ایک دور ہے جو نوبت بہ نوبت دنیا کی تمام قوموں

بلکہ کائنات کی ہر شئے پر طاری ہوتا ہے، قرآنِ کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔
وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ امید و یاس، شادی و غم اور فتح و شکست کے یہ ایام ہیں جو نوبت بہ نوبت انسانوں پر گذرتے رہتے ہیں

دنیا میں کوئی شئے نہیں، جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن بھی نہ دیکھے ہوں، اور باغ میں کونسا زندہ درخت ہے جس نے خزاں کے جھونکوں کے ساتھ کبھی نسیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں؟ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ذرہ بھی قوانین فطریہ و سلسلۂ علل و اسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب حالت بھی ایک قانونِ الٰہی اور ناموس فطری کے ماتحت ہے جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کئے ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں تم کبھی تبدیلی نہ دیکھو گے۔

باغ و چمن میں بہار و خزاں کا انقلاب ہو، دریاؤں میں جزر و مد کا اتار چڑھاؤ ہو، سمندروں میں سکون و ہیجان کا تغیر ہو، افرادِ حیوانی کی حیات و ممات اور شباب و کہولت کا ایاب و ذہاب، افراد کی صحت و علالت، اور اقوام کا عروج و زوال، یہ تمام حالتیں فی الحقیقت انہی قوانینِ الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے ماتحت ہیں، جن کو فاطر السمٰوات والارض نے اس عالم کے نظام و قوام کے لیے روزِ اول ہی سے مقرر کر دیا ہے۔ پھر جن افراد و اقوام نے ان قوانین کے مطابق راہ عمل اختیار کی ہے ان کے لیے امید کی زندگی ہے اور جنہوں نے اس سے

روگردانی کی ہے اُن کے لیے نامرادی و ناکامی کی مایوسی ہے۔ قانون جرم کی سزا دیتا ہے، پر مجرم کو جرم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ پس شکایت کارساز قدرت کی نہیں، بلکہ خود اپنی ہونی چاہیے۔ خدا نے اُمید کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے اور زمین کی راحت کسی ایک قوم کے ورثے میں نہیں دے دی ہے۔ اس نے پھول اور کانٹے دونوں پیدا کیے ہیں۔ اگر ایک بدبخت کانٹوں پر چلتا ہے، مگر پھولوں کو دامن میں جمع نہیں کرتا، تو اُسے اپنی محرومی پر رونا چاہیے۔ باغبان کا کیا قصور؟

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ — خدا کے انصاف سے بعید تھا کہ وہ کسی پر ظلم کرے مگر افسوس کہ بدعملیاں کر کے خود آپ اُنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ (۹: ۷۰)

دوسری جگہ فرمایا:-

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ — یہ سب بربادیاں تم نے خود اپنے ہاتھوں مول لیں، ورنہ اللہ تو اپنے بندوں کے لیے کبھی ظالم نہیں۔ (۸: ۵۱)

اس نے دنیا کے ایام و راحت، اور عیش و کامرانی کو انسان کے ماتحت نہیں بلکہ انسانی اعمال کا محکوم بنایا ہے، اور جب تک کوئی قوم خود اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کر دیتی، اس پر زمین کی راحتوں کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا — ان قوموں کو نامرادی و مایوسی کی یہ سزا اس لیے

نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸ : ۵۵)

دی گئی کہ ایسا ہی اس کا قانون ہے جو نعمت خدا نے کسی قوم کو دی ہو پھر وہ کبھی واپس نہیں لیجاتی تاآنکہ خود وہ قوم اپنی صلاحیت و قابلیت کو بدل نہ ڈالے

ماضی و حال

یہ انقلابات قدرتی ہیں، اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور ملکوں پر اس کے گذر چکے ہیں! آج اُمید و کامیابی کے جس آفتاب سے غیروں کے ایوانِ اقبال روشن ہو رہے ہیں، کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے، اور جس بہار کے موسم عیش و نشاط سے ہمارے حریف گذر رہے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باغ و چمن ہی میں اس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کہیے کہ کہنے کا وقت ہی چلا گیا!

گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں، جیسے کہ اب نظر آ رہے ہیں۔ زمانہ ہم سے ہمیشہ برگشتہ نہیں رہا۔ مدتوں اُمید کا ہم میں آشیانہ رہا ہے، بلکہ ہمارے سوا اس کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا۔ اب دنیا میں ہمارے لیے ماتم و نااُمیدی، دو ہی کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں، لیکن زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہماری زندگی کے لیے اسی دنیا میں اور بھی بہت سے کام تھے!

وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷ : ۱۶۸)

اور ہم نے اُن قوموں کو اچھی اور بُری اُمید و مایوسی فتح و شکست، دونوں حالتوں میں ڈال کر آزمایا کہ شاید یہ بداعمالیوں سے توبہ کریں اور راہ حق اختیار کرلیں۔

وَاِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُؤْمِنِیْنَ (۲۶: ۶۸)

اور بیشک اس انقلاب حالت میں عبرت و موعظت کی بہت سی نشانیاں ہیں مگر ان میں اکثر لوگ ایمان و ایقان کی دولت سے محروم تھے۔

ہجوم یاس، و اختلال نظامِ اُمید

مَنْ کَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ ھَلْ یُذْھِبَنَّ کَیْدُہٗ مَا یَغِیْظُ وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَّ اَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ (۲۲: ۱۵)

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن بد رکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اُس کی مدد کرے ہی گا نہیں، تو پھر اُس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک رسّی تانے اور اُس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگا لے اور اس طرح زمین سے (جہاں اب وہ اپنے لیے مایوسی ہی سمجھتا ہے) اپنا تعلق قطع کرلے، پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوس ہو رہا تھا دور ہوگئی یا نہیں؟ اسی طرح ہم نے قرآنِ کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اُتاری ہیں کہ تم اُن پر غور کرو اور اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعہ سے ہدایت بخشتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

موجودہ جنگ بلقان یا جنگ اسلام و فرنگ کی اگر تاریخ لکھی جائیگی تو اس میں شاید سب سے زیادہ موثر اور دردانگیز باب مسلمانانِ عالم کے اضطراب اُمید و بیم کا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ میدان جنگ میں صرف مجاہدین ترک تھے، جن کی

لاشیں دشمنوں کی گولیوں سے تڑپتی تھیں، لیکن دنیا میں کروڑوں قلوب بھی تھے جن کی لاشیں نہیں، مگر پہلو میں دل ہمیشہ تڑپتے رہتے تھے۔

واقعات نے جلد جلد اپنے اوراق اُلٹے۔ اُمیدوں کو عموماً شکست ہوئی اور توقعات میں بالعموم ناکامی۔ جنگ کے التوا کے بعد صلح کے مہلک اور خانماں سوز شرائط سُن کر وہ مضطرب تھے، مگر خود دارالخلافہ میں ایک جماعت آخری سعی و مجاہدہ کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی، اور دوبارہ اجرائے جنگ نے پھر ایک شعاع اُمید دکھلائی۔ حالات گو بدستور رہتے، نئی وزارت آئندہ کے لیے باوجود بے سرو سامانی کچھ نہ کچھ سامان کر سکتی تھی، مگر جنگ کے گذشتہ ایام میں اس کے بیشتر وجود کچھ کر چکے تھے، ان کی تلافی محال تھی۔ وہ محصور مقامات کو رسد نہیں پہنچا سکتی تھی، اور محصور قلعوں میں نئی فوج بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ باایں ہمہ مالی مشکلات کا انتظام کیا گیا، اور دو ماہ تک اس جنگ کو جاری رکھا جس کو ایک ہفتہ اور جاری رکھنے کی قوت بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی!

اس عرصہ میں اُمید تھی کہ حالات میں اور تغیرات ہونگے، اور ایڈریانوپل کے محاصرہ میں دشمن کے لیے مشکلات پیدا ہو جائینگی۔ اسباب و بواعث کی بحث کا یہ موقعہ نہیں ان کی تفصیل کسی دوسری جگہ پڑھیے گا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ حالات کے عین مطابق مگر ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کے خلاف ایڈریانوپل بھی مفتوح ہو گیا اور بظاہر ہر شخص نے محسوس کیا کہ آخری رشتۂ اُمید جو باقی رہ گیا تھا، اُس نے بھی بے وفائی کی۔

فان ما تحذرین قد وقعا

میں دیکھتا ہوں کہ ایڈریانوپل کے سقوط کی خبر نے ابنائے ملت کی ہمتوں
کو پست کردیا ہے، لوگ عموماً نا اُمید ہوگئے ہیں اور اکثروں کے دل بیٹھ گئے ہیں
یاس و اضطراب کا لشکر جب آتا ہے، تو اُس کا پہلا حملہ عقل و دماغ پر ہوتا ہے
لوگ حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور مایوس ہیں کہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ مرحوم
غالب نے اسی عالم کی تصویر کھینچی ہے ؎

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے
کار از دہا گذشتہ و افسوں نکردہ کس

حسِ مصائب رحمت الٰہی ہے

مصیبت کا احساس غم و ماتم کی صورت میں جس قدر شدید ہو بہتر ہے
کیونکہ زخم کی تکلیف جتنی سخت ہوتی ہے، اتنی ہی مرہم کے بنانے میں بھی
جلدی کی جاتی ہے اور قدرت الٰہی کی نیرنگیوں نے اکثر ایسا دکھلایا ہے کہ
یاس و نا امیدی جب حد انتہا کو پہنچ گئی ہے تو اسی کی زمین میں اُمید کی
سرِنو تخم ریزی ہوتی ہے۔

پس موجودہ مصائب کا حس جس قدر درد انگیز ہو، اس کو فال
نیک سمجھنا چاہیے، اور در اصل سچ پوچھیے تو ہماری زبانوں کے آہ و فغاں
دبیجتے ہوئے جس درجہ درد و الم دلوں میں ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے
کہ نہیں ہے۔ ہم میں کتنے ہیں جنہوں نے چند لمحوں کے اضطراب و تشویش
سے زیادہ اپنی زندگی اس غم میں تلخ کی ہے؟ اور پھر کتنے ہیں، جن کے حلق
سے ایک وقت کا کھانا بھی کسی بے چینی کے بعد اترا ہے؟

میں سفر میں تھا جب سقوط ادرنہ کی خبر آئی مجھے اس کے بعد متعدد مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا، اور میں نے مسلمانوں کے مختلف طبقات و درجات کی بہت سی آبادیاں دیکھیں۔ میں نے دیکھا کہ جو گذرنا تھا گذر گیا لیکن ہماری غفلت و مدہوشی کے اعمال، اور عیش جوئیوں اور راحت پسندیوں کے اشغال بدستور جاری ہیں یہ کہتے ہوئے خود اپنے تئیں ندامت اور تکلیف ہوتی ہے مگر افسوس کہ کہنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ دلوں کی بے چینی میں شک نہیں، اور ایک ٹیس جو پہلے نہ تھی اب شاید لاکھوں پہلوؤں میں محسوس ہو رہی ہے اگر ہزاروں ہیں جنہیں خواب غفلت سے مہلت نہیں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں جو گو اب تک بستروں پر لیٹے ہیں مگر اضطراب کی کروٹیں بھی بدل رہے ہیں، اور یہ یقیناً کارفرمائے قدرت کی ایک سب سے بڑی توفیق بخشی ہے۔ اگر موسم کے بدلنے کا وقت آگیا ہے تو اس کے آثار بھی کم نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے آتشکدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے کہ اُن کے اندر سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھ رہے تھے، حالانکہ چند گھنٹے پیشتر ان کی تہ میں چند بجھی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب باد تند و تیز کے چند جھونکے میسر آگئے، تو چشم زدن میں دہکتے ہوئے انگاروں اور اُچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا۔ پھر کیا عجب ہے کہ سوز و تپش کی جو چنگاریاں اس وقت دلوں میں بجھی ہوئی نظر آرہی ہیں، توفیق الٰہی کی باد شعلہ افروز انہی سے اس آتشکدۂ حیات کو گرم کر دے جو افسوس ہے کہ روز بروز خاکستر سے بھرتا جاتا ہے!!

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ (۲۲:۶۰)

یہ اُمید اس لیے ہے کہ قدرتِ الٰہی کی نیرنگیوں سے ایسا ہونا کچھ بعید نہیں۔ وہ رات کی ظلمت سے دن کی روشنی کو اور دن سے رات کو پیدا کرتا ہے اور ہماری تمام اُمیدوں کو دیکھتا اور دعاؤں کو سُنتا ہے۔

لیکن مایوسی پیام موت ہے

لیکن ساتھ افسوس ہے کہ موجودہ حسِ مصائب اور استیلائے غم و اندوہ کا رُخ تنبہ و اعتبار کی طرف نہیں ہے، بلکہ عموماً مایوسی اور نااُمیدی کی صورت میں ہے۔ جس طرف دیکھتا ہوں، سقوط ایڈریانوپل کے حادثہ پر یاس و قنوط کے جذبات کو احاطہ کیے ہوئے پاتا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ اب کیا باقی رہ گیا ہے جس کے لیے اُمید کی جائے؟ اور بدقسمتی نے کیا چھوڑا ہے، جو ہمتوں میں مستعدی پیدا کرے؟ اب یا تو ماتم کی صفیں بچھائیے یا سیلابِ بدبختی کی رو پر اپنے تئیں چھوڑ دیجیے کہ جب ڈوبنا ہی ہے تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے کیا فائدہ؟

پھر کیا آخری سوالات کا وقت آگیا؟

بہتر ہے کہ اس بارے میں میری زبان پر صاف صاف سوالات ہوں، پھر کیا وقت آگیا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے مایوس ہوجائیں؟ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ اُمید و یاس کی تقسیم میں اب ہمارے لیے صرف یاس ہی رہ گئی ہے، اور تکمیل فنا میں جس قدر وقت باقی رہ گیا ہے، اُس میں صرف رفتہ کا ماتم، اور آئندہ کی نااُمیدی دو ہی کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں؟ کیا یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہماری زندگی کی آخری ساعات اور موت کے احتضار کی آخری حرکت ہے؟

کیا چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور بجھنے کا وقت قریب ہے؟ اور سب سے آخر یہ کیا اعدائے اسلام اور اسلام کا آخری مقابلہ ہو چکا، اور (یسوع) کی مصلوب اور مردہ لاش نے خدائے حی و قیوم پر فتح پا لی؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات مختلف شکلوں میں آج بہتوں کے سامنے ہونگے، ممکن ہے کہ مایوسی کا غلبہ میرے اعتقاد کو مغلوب کر لے اور اس لیے ممکن ہے کہ میں تسلیم کر لوں کہ ہمارے مٹنے کا وقت آ گیا ہے، مگر میں نہیں سمجھ کہ کوئی مسلم قلب، جس میں ایک ذرہ برابر بھی نور اسلام باقی ہے، ایک منٹ ایک لمحہ، ایک دقیقے اور ایک عشر دقیقے کے لیے بھی اس کو مان سکتا ہے کہ اسلام کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

انسانوں ہی نے ہمیشہ انسانوں کو مغلوب کیا ہے اور نئی قوموں نے ہمیشہ پرانی قوموں کی جگہ لی ہے۔ اس کا حریف اس عالم میں دیو نہیں بلکہ انسان ہی ہے پس یہ کوئی عجیب بات نہیں اگر ہم کو ہمارے سیزدہ صد سالہ دشمن آج مغلوب کر کے فنا کر دیں، مگر اے خدا کی رحمت کی توہین کرنے والو! میں یہ کیونکر مان لوں کہ ایک مصلوب لاش حی و قیوم خدائے ذوالجلال کو مغلوب کر سکتی ہے؟ اور مایوسی خواہ کتنی ہو، مگر کیونکر تسلیم کر لوں کہ انسانی گروہ خدائے قادر و ذوالجلال کی جبروت و کبریائی کو شکست دے سکتے ہیں؟

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں، حالانکہ میں تو کفر مایوسی کے تصور سے کانپ جاتا ہوں، کیونکہ یقین کرتا ہوں کہ مایوس ہونا اس خدائے ذوالجلال والاکرام کی شانِ رحمت و ربوبیت کے لیے سب سے بڑا

انسانی کفراور اُس کی جناب میں سب سے بڑی نسل آدم کی شوخ چشمی ہے تم جوان بربادیوں اور شکستوں کے بعد مایوس ہو رہے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے خدا کے اسلام کی قوت و رحمت کو کس پیمانہ سے ناپا ہے؟ وہ کونسا کاہن ابلیس ہے جس نے خدا کے خزانہ رحمت کو دیکھ کر تمہیں بتلا دیا ہے کہ اب اس میں تمہارے لیے کچھ نہیں؟ اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹:۸۲) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ (۵۲:۴۲) پھر تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم مایوس ہو رہے ہو اور کیوں تم نے خدا کی طرف سے مُنہ پھیر لیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ اب ہمارے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ایک مسلم دل کے لیے تو نا اُمیدی سے بڑھ کر کوئی کفر نہیں ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا!! (۱۹:۹۲)	یہ تو تم نے ایسی بڑی سخت بات مُنہ سے نکالی ہے جس کی وجہ سے عجب نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو کر زمین کے برابر ہو جائیں۔

اُمید و بیم

وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ؟	خدا کی رحمت سے کافروں کے سوا اور کون مایوس ہو سکتا ہے!

انسان شاید یاس و اُمید کے بارے میں کچھ فطرتاً عاجل ہے اس کی فطرت سادہ بچوں کی مثال سے واضح ہوتی ہے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ ہر حالت کا اثر بغیر تفکر و تدبر کے دفعۃً قبول کر لیتے ہیں روتے ہوئے بچے کو مٹھائی کا

ایک ٹکڑا اکڑا دیجیے تو ہنسنے لگتا ہے، اور چھین لیجیے تو فوراً مچل جاتا ہے۔
بعینہٖ یہی حال عقل و فکر کے نشو و نما کے بعد بھی انسان کا ہوتا ہے۔
البتہ تاثر و نتائج کی صورت بدل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی فطرت انسانی کی عجلت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جبکہ کہا ہے کہ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ" انسان کی خلقت میں جلد بازی اور تعجیل کا رہے۔

مصائب کے حس اور شادمانی کے غرور میں بھی دیکھیے تو اس کی یہی جلد بازی اور زود اثری ہر موقع پر کام کرتی ہے۔ وہ کس قدر جلد غمگین ہو جاتا ہے اور پھر ایک روتے ہوئے بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا دیدیا گیا ہو، کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے! اس کی مایوسی اور امیدواری دونوں کا یہی حال ہے۔ جب کبھی وہ اپنی کسی توقع میں ناکامی دیکھتا ہے تو فوراً مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور پھر جب کبھی کوئی کامیابی کی خبر سن لیتا ہے تو امید و مسرت کے ضبط سے عاجز ہو کر اچھل پڑتا ہے۔ حالانکہ نہ تو اس کو ان اسباب کی خبر ہے جو غم و نامرادی کے پیچھے ظاہر ہونے والے ہیں، اور نہ ان عواقب و نتائج کی خبر ہے جو بشارت امید کے بعد پیش آنے والے ہیں۔ اس کی خدا پرستی بھی اس جلد بازانہ یاس و بیم سے شکست کھا جاتی ہے۔ اگر کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے، اور اگر نتائج حالات اور مشیت الٰہی کسی ابتلاء و مصیبت میں ڈال دیتی ہے تو دیوانہ وار مایوس ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھ کو چھوڑ دیا۔ سورۂ والفجر میں اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے اور تمہارے اندر وہ کونسی شئی ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ نہیں کیا؟

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹: ۱۵)

انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کے ایمان کو اس طرح آزماتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت اور نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ فوراً خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا پروردگار میرا اعزاز و اکرام کرتا ہے اور جب اُس کے ایمان کو کسی آزمائش میں ڈال کر اس طرح آزماتا ہے کہ اس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا یعنی مصیبت میں ڈال دیتا ہے تو پھر معاً مایوس ہو کر کہنے لگتا ہے کہ میرا پروردگار تو مجھے ذلیل کر رہا ہے اور میرا کچھ خیال نہیں کرتا

حیاتِ اُمید و موتِ قنوط

منجملہ اس حالت کے سب سے زیادہ خطرناک گمراہی انسان کی وہ مایوسی ہے، جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھ کر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لیے نامرادی و ناکامی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شئے انسانیت کے لیے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف اُمید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ اُمید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی قہاری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اُس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر اُمید ہی ہے جس نے مردہ

قلوب کو زندہ کیا ہے، بستر مرگ سے بیماروں کو اُٹھایا ہے، ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنادیا ہے۔

جبکہ توتیں جواب دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی، اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دیدیتے ہیں تو اُمید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے، جو مُسکراتا ہوا آتا ہے، اپنے پروں کو کھولتا ہے، اور اس کے سایہ میں لے کر قوت و طاقت، ہمت و مستعدی، چستی و چالاکی کی ایک روحِ تازہ دلوں میں پیدا کردیتا ہے!

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لیے پہلی چیز اُمید ہے۔ جب تک انسان کے اندر اُمید قائم ہے، مصیبتوں اور بلاکتوں کے اگر عفریت بھی سامنے آکھڑے ہوں، تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اُس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لیے ضروری ہے تو یقین کیجیے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لیے اُمید اُس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے، جب تک اس کا دوران دل سے اُٹھ کر یا باصطلاح حال دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے، اس کی قوتِ عمل زندہ، اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تگاپو ہیں، لیکن جہاں یہ روحِ حیات دل سے نکلی، پھر جسم انسانی کے لیے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔

ایک شخص جب مایوس ہوگیا، جب اُس نے یقین کرلیا کہ اب

اس کے لیے دنیا میں کچھ نہیں، جب اُس نے فیصلہ کرلیا کہ اب خدا اُسے کچھ نہ دیگا۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا دماغ کیوں نہ سوچے؟ دل میں اُمنگ کیوں پیدا ہو؟ ہاتھ کیوں ہلے؟ اور پاؤں بڑھنے کے لیے کیوں متحرک ہوں؟

قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل اُمید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے، اور خواہ ناکامی اور مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر اُمید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشے سے نہیں اُڑتا۔ وہ دنیا کو ایک کارگاہِ عمل سمجھتے ہیں، اور اُمید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر آج تم اس پر قابض نہیں ہو تو غم نہیں، کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے۔

مصیبتیں جس قدر آتی ہیں، وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتے ہیں، اور غم و اندوہ سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے، بلکہ مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور کرتے ہیں۔ نامرادی ان کے دلوں کو مجروح کرتی ہے، پر مایوس نہیں کرتی، اور غم کے لشکر سے ہزیمت اُٹھاتے ہیں، پر بھاگتے نہیں۔

دنیا ایک میدانِ کارزار ہے، اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو در اصل یہ ایک حریفانہ کشمکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اُسے کامیابی اور ناکامی اور فیروزمندی و نامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا

ضروری ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر و سینے میں بھی زخم کے نشان پائیں؟ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، لیکن سپاہی کو زخموں پر زخم کھا کر بھی اُف نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں، بلکہ میدانِ جنگ ہے۔

شکست و زخم کا خوف ہے تو میدانِ جنگ میں قدم ہی نہ رکھو، اور تلووں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو، اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا، اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو؟ .. مایوسی خودکشی ہے اور اُمید زندگی، اور زیادہ چابک دستی سے پیکارِ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے، زیادہ ہمت مطلوب نہ تھی، لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے۔

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر فرد ایک پیکرِ اُمید ہوتا ہے، اور اپنے دل کو اُمید کی جگہ سمجھتا ہے نہ کہ مایوسی کی۔ لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زندہ قوموں کے لیے مایوسی کے اسباب ہی میں اُمید کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی بڑھتی ہیں، اتنی ہی وہ اپنی اُمید کو اور زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں

مصیبتیں ان کو مایوس نہیں کرتیں، بلکہ غفلت سے ہشیار کر دیتی ہیں اور عبرت و تنبہ کی صورت میں ان کے سامنے آتی ہیں۔ وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ کر بھاگتے نہیں بلکہ اُس راہ کو ڈھونڈھ کر بند کرنا چاہتے ہیں، جہاں سے اُس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہے۔

پس مصائب اُن کے لیے رحمت ہو جاتے ہیں، اور نامرادی اُن کے لیے کامیابی کا دروازہ کھول دیتی ہے، وہ جس قدر کھوتے ہیں اتنا ہی زیادہ پاتے ہیں، اور جس قدر گرتے ہیں اتنا ہی زیادہ مستعدی سے اُٹھتے ہیں۔ وہی دنیا جو کل تک ان کے لیے نامرادیوں کا دوزخ تھی یکایک کامیابیوں کا بہشت بن جاتی ہے، اور جس طرف دیکھتے ہیں، تخت فتحیابی بچھے ہوئے اور انہار کامرانی بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی بہشت اُمید ہے جس کے رہنے والوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ:۔

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا (۷۶: ۱۲)	کامیابی و فیروزمندی کے تخت پر تکیے لگائے بیٹھے ہونگے، غم و اندوہ کی سوزش و تپش کا انہیں حس تک نہ ہوگا۔

کیونکہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، پس دنیا بھی ان کو مایوس نہیں کرتی۔

ہلاکت اُمید اور موت قنوط

لیکن اسی طرح قومی زندگی کے ایام ممات، اور انسانی ارتقائے حیات کا سد باب اُس دن سے شروع ہوتا ہے جس دن کا شانۂ دل

سے اُمید کا جنازہ اُٹھنا، اور مایوسی کا لشکر فتنا اُمنڈتا ہے جس فرد یا جس قوم کو مصیبتوں اور ناکامیابیوں کے عالم میں مایوس دیکھو، یقین کرو کہ اس کا آخری دن آ گیا۔ مصیبتیں تو اس لیے تھیں تاکہ غفلت کو شکست اور ہمت کو تقویت ہو، لیکن جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں، دنیا کے اعمال و تدابیر کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں، اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہمارے لیے دنیا میں کچھ نہیں رہا، وہ تو خود اپنے لیے زندگی کے بدلے موت کو پسند کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی کامیابی زندگی کو لڑ کر لینے والوں کے لیے ہے، مٹ جانے کے متلاشیوں کے لیے نہیں ہے۔

دیکھو! قرآن کریم نے کیسے جامع الفاظ میں ایسے لوگوں کی حالت اور ان کی مایوسی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس نے کس چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا، مگر افسوس کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس کی صداؤں پر کان لگاتے ہیں!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۲: ۱۱)

اور انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کی پرستش تو کرتے ہیں مگر ان کے دلوں میں استقامت نہیں ہوتی۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہو گئے اور اگر کبھی مصیبت آ پڑی تو جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں اُدھر ہی کو لوٹ گئے (یعنی مایوس ہو کر ایمان سے ہاتھ اٹھا لیا)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی اور یہی سب سے بڑا اور صریح

(۲۲ : ۱۱)　　　　نقصان ہے۔

فرمایا کہ "خسر الدنیا والآخرۃ" کیونکہ مایوسی کے بعد انسان کی قوت عمل معطل ہو جاتی ہے۔ پھر نہ وہ صرف دنیا ہی میں ناکام و نامراد رہتا ہے بلکہ عاقبت کی خوشحالی سے بھی اُسے ناامیدی ہی ملتی ہے۔

انسان کا فرض سعی و تدبیر ہے۔ اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے، اس کو سعی و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے۔ ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے، اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے، ڈاکٹر بھی جواب دے دیتے ہیں، تاہم سعی و علاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے، تو تعجب ہے کہ قوم وملت کے ساتھ نہ ہو! کس کو معلوم ہے کہ کب دروازۂ رحمت کھلنے والا ہے؟ اور کب بارش ہونے والی ہے؟ دہقان کا کام صرف یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے

چوں دمیدم عنایت توفیق ممکن است
در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

فتح وشکست کا اصلی میدان

دل کے اندر ہے نہ کہ اُس سے باہر

یہاں تک میں نے جو کچھ لکھا، یہ عام انسانی حالت کے اعتبار سے تھا، لیکن اب سوچنا چاہیے کہ بہ حیثیت اسلام کے اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

پھر میں نہیں سمجھتا کہ اگر موجودہ جنگ میں ہر طرف نتیجہ شکست ہی ہو!

اور مسلمانوں کو اپنے آخری دنوں میں ایک سب سے بڑی نقصان رساں شکست اُٹھانی پڑی تو اس سے فرزندان اسلام مایوس کیوں ہوجائیں؟ اگر ایڈریانوپل چھ مہینے کی عدیم النظیر مدافعت اور آخر کے محیر العقول مقابلہ ومقاتلہ کے بعد بالآخر قدرتی اسباب وحالات کی بنا پر مفتوح ہوگیا تو پھر چالیس کروڑ فرزندان اسلام کی حصن اُمید لشکر مایوسی سے کیوں مفتوح ہوجائے؟ یہ سچ ہو کہ ہمارے دشمنوں نے میدان جنگ میں ہمیں شکستیں دیں لیکن ابھی وہ اس اُمید کو تو شکست نہیں دے سکتے جو ہر مسلم دل کو اسلام کے خدائے قادر وقیوم سے ہونی چاہیے؟

ایک لاکھ سے زیادہ سردی وبلغاری لشکر توپوں کے دہانے کھول کر اگر ایڈریانوپل کی مٹی کی دیواروں کو ڈھا دیتا ہو تو یہ کونسا دنیا کا نیا اور عجیب واقعہ ہو؟

اُس قوم کے لیے کونسی شرم کی بات ہو، جس نے سترہ ہزار فوج کے ساتھ ایک بے پناہ اور مٹی کی دیواروں سے بنے ہوئے مقام میں چھ مہینے تک مدافعت کی ہو؟ اس پر ہمیں ماتم نشین ہونے کی ضرورت نہیں ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مان سکتے کہ بلغاری وسردیوں نے ہماری جرأت وشہامت کو شکست دے دی۔ اے اُس خاندانِ اسلام کے ماتم گسارو! جس کے چالیس کروڑ فرزند اس وقت سطح ارضی پر چلتے پھرتے ہیں! اگر یہ سچ ہو کہ تمہارے دل بھی مایوس ہوگئے ہیں، اور تمہارے دل کے اندر خدائے ابراہیمؑ ومحمدؐ (علیہما الصلوٰۃ والسلام) نے جو چراغ امید روشن

گیا تھا وہ بھی بجھ گیا ہے، تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی سردی اور بلغاری مجاہدین نے تم کو شکست دے دی، اور تیرہ سو برس کے اندر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اور انسانوں کے بڑے بڑے لشکر جس دشمن کو گرا نہ سکے تھے، آج واقعی بلقان کی چند ریاستوں کے اجماع نے اُسے گرا دیا!!

ہاں اگر یہ سچ ہے تو بیشک تمہاری لافنا زندگی کو جسے قیصر روم اور کسرائے فارس موت سے بدل نہ سکا تھا، اس نے مجروح کر دیا ہے۔ تمہارے ان آہنی جسموں کو جنہیں یرموک کے میدان میں متمدن رومیوں کے لاکھوں تیروں کے نشانے زخمی نہ کر سکے تھے یقیناً اس نے خاک و خون میں تڑپا دیا ہے اور تمہارے ان نشانہائے توحید اور علمہائے دین الٰہی کو جسے آٹھ صلیبی حملوں کے لاکھوں نیزے بھی نہیں گرا سکے تھے، سچ یہ ہے کہ سرو پائے شور چرانے والوں نے آج پارہ پارہ کر کے گرا دیا ہے۔ پھر اس میں شک نہیں کہ تم مر گئے، تم جو کبھی نہیں مر سکتے تھے، یقیناً مر گئے تم، کہ تمہاری رگوں کے اندر خدا کی روح جلال جاری و ساری تھی، اور اُس کی نصرت و حمایت کے ملائکہ مسوّمین تمہارے آگے دوڑتے تھے، یقیناً آج مر گئے۔ پس جس قدر تم کو ماتم کرنا ہے کر لو، اور جس قدر جلد اپنی قبر کھود سکتے ہو کھود لو، کیونکہ خدا کی رحمت اور دنیا کی زندگی صرف اُمید رکھنے والوں کے لیے ہے اور مایوسی کا نتیجہ موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تم کو نہیں چھوڑتا پر تم اُسے چھوڑ رہے ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھتا، لیکن تم نے نا اُمید ہو کر اس کی طرف

سے مُنہ موڑ لیا، تم کو معلوم نہیں کہ یہی مایوسی ہے جس کو تمہارے خدا نے کفر کی خودکشی سے تعبیر کیا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ۝ وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَأَنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يُرِيدُ (۲۲: ۱۵)

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن بد رکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اُس کی مدد کرے ہی گا نہیں، تو پھر اُس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک رسی تا لے، اور اُس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگا لے اور اس طرح زمین سے (جہاں اب وہ اپنے لیے صرف مایوسی سمجھتا ہے) اپنا تعلق قطع کر لے، پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوس ہو رہا تھا، دور ہو گئی ہے۔ اسی طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں، تاکہ تم اس پر غور کرو اور اللہ جس کو چاہتا ہے اُس کے ذریعہ سے ہدایت بخشتا ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشانست

سب سے پہلے تو ہم مایوسی کے اس حصہ ہی کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ دولت عثمانیہ اور ترکوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اس جنگ نے انہیں اب بالکل عضو معطل کر دیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ابھی اس کے بعد سنبھلنے کے لیے کئی میدان باقی ہیں اور اگر عبرت اور تنبیہ کی یہ سب سزائیں بے اثر نہ رہیں اور بقیہ قوائے عاملہ کو ابھرنے اور کام کرنے کی توفیق

مل جائے تو اب بھی یہ قوم جس کی شمشیر آٹھ سو برس سے علم اسلامی کے لیے مدافعت کر رہی ہے، پنپ سکتی ہے اور حالات فوراً متغیر ہو جا سکتے ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لیے دو طرح کی نظریں رہی ہیں ایک اُمید کی اور دوسری مایوسی کی۔ حکمائے یونان کی نسبت سُنا ہو گا کہ آثار و نتائج عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب، اُمید اور مایوسی کے تھے۔ پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے، وہ اسی رنگ میں نظر آئیگی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اُس کے دلائل بے شمار ہیں، اور اُمید کا مذہب اختیار کرو تو اس کے پہلو مایوسی سے کم نہیں۔ اسلام ہم کو ہمیشہ اُمید کی تلقین کرتا ہے، پس کیوں نہ ہم اُمید کے پہلوؤں ہی پر نظر ڈال لیں؟

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو

. . . .

با ایں ہمہ حالات ترکوں کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ اور اگر پھر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اب ترکوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو مجھ کو خدا کے لیے جواب دو کہ کیا تمہارے خدا کی قوت کا بھی خاتمہ ہو گیا؟ مان لو کہ ترکوں کی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی اور اب ٹوٹ کر اُن کے ہاتھوں سے گر گئی ہے، لیکن کس کو معلوم ہے کہ ابھی خدا کے لازوال خزانۂ قدرت میں اور کتنی غیر مستعمل تلواریں پڑی ہیں، جن کو وہ اپنے دین مبین اور کلمۂ محبوب کی ہدایت کے لیے چمکا سکتا ہے؟ اسلام ایک قوت الٰہیہ ہے جس کی زندگی انسانوں اور قوموں سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ قوموں کی

زندگی اس کی متابعت اور معیت سے وابستہ ہے۔ پھر قومیں مٹ سکتی ہیں اور انسان کے فانی جسم مٹ سکتے ہیں، پر وہ نہیں مٹ سکتا، وہ اپنے خدائے لازوال کی غیر فانی قوت کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ کیونکہ وہ صداقت ہے، اور صداقت کب نہ تھی اور کب نہیں رہیگی؟

اسلام کا ظہور ترکوں کے ظہور کے ساتھ نہیں ہوا ہے، بلکہ ترکوں نے اُس کے دم سے اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہے۔ کیا تیرہ سو برس پہلے جب غار "حرا" کے غاروں سے حق کی روشنی چمکی، تو اُس وقت ترکوں کا ہاتھ اس کا محافظ تھا؟ کیا "بدر" اور "حنین" کے میدانوں میں ترک تھے جن میں سے تین سو فاقہ مستوں نے تین ہزار جوانان عرب کو خاک و خون میں ملا دیا تھا؟ کیا "یرموک" اور "قادسیہ" کے معرکہائے خونیں میں وہ ترک ہی تھے، جنہوں نے رومیوں اور ایرانیوں کی ہزاروں لاشوں سے صحرائے شام و مدائن کو بھر دیا تھا؟ وہ قوم جس نے تختِ کسریٰ کی ہزار ہا سالہ عظمت کا خاتمہ کر دیا تھا، ترکوں کی تو نہ تھی۔ وہ جس نے سپہ سالار روم کے سامنے اپنے نیزے کو ریشمین قالین کے اندر سے زمین میں چبھو دیا تھا، یقیناً کوئی ترک تو نہ تھا۔

پھر "دمشق" اور "بغداد" کے تخت پر کون تھا؟ اور کن کے گھوڑے تھے، جنہوں نے (بحر الکاہل) کے مہلک طوفان سے گذر کر جبل الطارق پر علم توحید بلند کر دیا تھا؟ ترکوں کو تختِ خلافت اسلامی پر قدم رکھے کتنے دن گذرے ہیں؟ خدا کے لیے ان سوالوں کا جواب دو! ترکوں

سے پہلے جس قوت نے ہمیشہ علم توحید کی حفاظت کی ہو کیا وہ آج ترکوں کے بعد کسی دوسری قوم کو بھیج کر نہیں کرسکتی؟ نادانو! تم نے اگر اللہ کی بخشی ہوئی حکومت وعزت کو کھو دیا ہو تو غم نہیں، لیکن یہ کیسا بدبختی ہو کہ اپنے دلوں اور دلوں کی روح امید کو بھی کھو رہے ہو؟

اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں حفاظت اسلام کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں۔ جب تک انہوں نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال واعتقادات میں اس سے منہ نہیں موڑا، اس وقت تک وہ بھی ان کے ساتھ رہا، لیکن جب انہوں نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کھو دی، اور اس مقصد کو بھول گئے، جس کی انجام دہی کے لیے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی، تو ان کا دور کار فرمائی ختم ہو گیا اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی امانت کسی دوسری جماعت کے سپرد کر دی۔ وہ اپنے کلمہ مقدس کی حفاظت کے لیے ہمارا محتاج نہیں ہو، بلکہ ہم اپنی زندگی کے لیے اس کے دین مبین کی خدمت گزاری کے محتاج ہیں

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ	اے لوگو! تم اللہ کے دروازۂ فضل وتوفیق کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز اور بے نیازی کی تمام صفتوں سے متصف ہو۔ اگر وہ چاہے تو تم کو چھوڑ دے اور تمہاری جگہ اپنی دوسری مخلوقات کو بسا دے اور ایسا کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

دوسری جگہ سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے۔

وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا ۝ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيرًا	اور اگر تم اس کے آگے نہ جھکوگے تو وہ تمہارا کچھ محتاج نہیں ہے کیونکہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے زیر حکم ہے اور وہ بے نیاز اور ہمہ صفت موصوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو اے مغرور انسانو! تم سے اپنی زمین کو خالی کردے اور اس کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسائے اور وہ ایسا کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

لَا تَايْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ

نومید مشو، کہ نا امیدی کفر است

پھر یہ ممکن ہے کہ اس کائنات ارضی کا ہر مخلوق نا امید ہو جائے یہ بھی محال نہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسانی جماعتیں مایوسی کو اپنا قبلۂ مقصود بنالیں لیکن جن لوگوں کے دلوں کو اسلام کی امانت سپرد کی گئی ہے وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اسلام سرتا سر امید ہے، اور اور وہ جب کبھی کسی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے وہ امید ہی ہے۔ اس کی اصطلاح میں ایمان امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبدا ہے حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ:۔

لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ | خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے کوئی
اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ | مایوس نہیں ہو سکتا مگر وہی بدبخت قومیں جنھوں نے اپنے
اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ | دلوں کو کفر کا آشیانہ بنا لیا ہے۔ (۱۲: ۸۷)

اس کی پہلی آواز اپنے ہر پیرو کے لیے یہ ہے کہ "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ: وہ مایوسی کو کسی حال میں ایک مومن کے لیے جائز نہیں رکھتا اور کہتا ہے وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ دنیا میں مسلمان مایوسی کے لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں، وہ صرف اُمید کے لیے ہیں، اور جس دن اس کے لیے نہ ہوں، اس دن وہ مسلم بھی نہیں۔ یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے، مگر اُس آیۂ کریمہ کو یاد کرو جس سے اس مضمون کا افتتاح ہوا ہے خدا نے مایوس ہو جانے والوں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ مایوس ہو گئے ہیں تو اُن کے رہنے کے لیے میری پیدا کی ہوئی دنیا موزوں نہیں "فلیمدد بسبب الی السماء فلیقطع" ان کو چاہیے کہ رسّی کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کر لیں، کیونکہ مایوسی کی دوسری منزل خودکشی ہے۔

"الہلال" اپنی ہر اشاعت میں اس صدائے الٰہی کو دہراتا ہے
لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

تسخیر ادرنہ

صبحِ اُمید کہ بُد معتکفِ پردۂ غیب
گو بروں آے کہ کارِ شبِ تار آخر شد

ادرنہ مسخر ہو گیا۔ فاتحانِ عثمانی شہر میں داخل ہو گئے۔ دُنیا نااُمید ہو چکی تھی، یورپ سمجھ چکا تھا کہ ترک جاں بلب ہیں، اب وہ اقدام کے قابل ہی نہیں رہے، لیکن قدرتِ کاملہ کے دستِ اعجاز نے اسی بیمار سے تندرستوں کو شکست دلائی۔ ترکوں کا اجتماع ہوتے ہی بلغاری مرعوب ہو کر بھاگ نکلے۔ اپنے استحکامات جو بڑی کوششوں سے استوار کیے تھے، اور ان کو ناقابلِ تسخیر سمجھے ہوئے تھے، آپ ڈھا دیے، اور خدا کا وعدہ پورا ہو گیا کہ قانونِ الٰہی کے حدود توڑنے والے اور تعلیمِ رسالت کی بے حرمتی کرنے والے انجام کار تباہ و برباد و خستہ و خراب ہو کر رہیں گے۔

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ — وہ خدا ہی ہے جس نے اہلِ کتاب کی اس جماعت کو کہ احکامِ الٰہی کی منکر ہو چکی تھی، اس کے گھروں

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(۵۹ : ۲)

سے مسلمانوں کے پہلے ہی اجتماع میں نکال باہر کیا۔ مسلمان سمجھے تھے کہ نہ نکل سکینگے اور خود ان کو بھی گمان تھا کہ ان کے قلعے خدا سے ان کو بچا لینگے۔ آخر اس طرح غضب الٰہی نازل ہوا کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں پر رعب و ہیبت چھا گئی۔ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں ہی ویران کرنے لگے مسلمانوں نے بھی اس ویرانی میں انہیں مدد دی۔ جن لوگوں کے آنکھیں ہوں انہیں اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے خدا اگر ان کی قسمت میں اخراج نہ لکھ دئے ہوتا تو دنیا ہی میں ان کو عذاب دیتا، اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ سبب یہ ہے کہ خدا و رسول کی تعلیم سے انہوں نے منہ موڑ لیے اور جو اب کرتا ہے اسے یقین کر لینا چاہیے کہ خدا کا عذاب نہایت سخت ہے۔

ایڈریانوپل کو جب بلغاریوں نے فتح کیا تو اپریل کے فورٹ نائیٹلی ریویو میں ایک مشہور انگریز مسٹر ہربرٹ ویوین نے لکھا تھا کہ "ایک لاسلکی پیغام اناطولی کے صحرا و جبل میں اس خبر کو مشہور کرتا ہوا گذرا ہے کہ پرانے مہیب فرمانروا (ترک) کی حاکمانہ زندگی کا آفتاب ڈھل گیا، عجیب وغریب طلسماتی قلعہ ٹوٹ گیا، جہاد'

اسلامی اتحاد، اور بے شمار مسلمان جنگجویوں کے غیظ و غضب سے دھوکے کھل گئے۔"
لیکن اب ان کو یقین کرنا چاہیے کہ اسلام کی طاقت کو فریب سمجھنے میں وہ خود دھوکے میں تھے۔ اسلام اپنی قہاری کے نتائج دکھانے میں کبھی ناتوان و ضعیف نہ نکلیگا۔ اس نے ایک مدت سے پیغام دے رکھا اور یہ پیغام پورا ہو کر رہیگا کہ:

سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ،	کفار کی جمعیت عنقریب منہزم ہو جائیگی اور وہ پیٹھ
بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ	دکھا کر بھاگینگے بلکہ ابھی ان کا وعدہ ہو اور وہ گھڑی
السَّاعَةُ اَدْهٰی وَ اَمَرُّ، اِنَّ	بڑی مصیبت کی تلخ ترین گھڑی ہو۔ یہ گنہگار ہیں، یہ
الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ،	گمراہی اور آگ میں ہیں، وہ دن آنے والا ہو جبکہ منہ
یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی	کے بل یہ آگ میں کھینچے جائینگے، اور ان سے کہا
وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ	جائیگا کہ عذاب دوزخ کا مزہ چکھو۔ ہم نے ہر چیز
اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ،	کو اندازے سے پیدا کیا ہو۔ ہمارے حکم کو ایک ذرا
وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ	آنکھ جھپکنے کی طرح پہنچا ہوا سمجھو۔ دیکھتے نہیں کہ
بِالْبَصَرِ، وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا	ہم نے تمہارے حامیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ کیا اب
اَشْیَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ	بھی تم میں کوئی غور و فکر سے کام لینے والا نہیں؟

(۳۱:۵۴)

بطل ادرنہ

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں، آگ کی ایک چنگاری بڑے بڑے آتشکدوں اور تنوروں کو شعلوں سے بھر دیتی ہے، ایک بیج صدہا شاخیں اور ہزاروں پھل پیدا کر دیتا ہے، بارانِ رحمتِ الٰہی کا ایک شاداب دن پوری فصل کو سرسبز کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ موتی کا ایک بڑا دانہ پورے ہار کی عزت بڑھا دیتا ہے، ہیرے کا ایک درخشندہ ٹکڑا پورے تاج کے حسن و جمال کے لیے بس کرتا ہے، کیوڑے کا ایک درخت پورے باغ کے معطر ہونے کے لیے، گلاب کا ایک قیمتی پھول پورے ایوان و منزل کی رونق کے لیے اور بہ تمثیل سادہ تر ایک چراغ پورے کمرے کی روشنی کے لیے کافی ہوتا ہے۔

یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔ قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو ہزاروں افراد کے ذریعہ نہیں بلکہ ہمیشہ سرچشمۂ حیات ایک یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ و عدیدہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت

میں جب ایک عمدہ بیج بارآور ہو کر سر اٹھاتا ہے تو اس سے صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں اور اُن میں ہزار ہا تر و تازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔

پس باغ کی زمین کی طرح اس سرزمین کی شادابی کے لیے بھی بہت سی خاردار اور بے ثمر جھاڑیوں اور درختوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہی درخت کی۔

ایک ہی انسان چاہیے جو انسان ہو اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کر دے۔ اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے ہے مگر اقوام کی زندگی صرف اشخاص ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں لیکن ان کی موت و حیات کے یہی معنی ہیں کہ پہلی صورت میں اُن نفوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی، اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود رہتے ہیں جو اپنی زندگی کے سرچشمے سے پوری قوم کے کشتِ اقبال کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں؟

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر سے
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

یہ ایک قاعدہ طبیعی ہے کہ کوئی زمین خواہ کیسی ہی بنجر نظر آئے اور خواہ کتنی ہی اسباب و وسائل کشت کاری اور تربیت و پرورش زرعی سے محروم ہو، لیکن اگر اس کی قوت نشو و نما بالکل معدوم نہیں ہو گئی ہے تو اُس کا کوئی نہ کوئی

گوشہ سرسبز اور کسی نہ کسی کونے میں کوئی ہیج سربرآورنظر آئیگا اور ایسا ہونا اس امر کی دلیل سمجھا جائیگا کہ گو اس زمین کو اپنے خزانہائے نباتاتی کے ظہور کے وسائل حاصل نہیں اور اسباب و ذرائع سے محروم ہو کر بنجر اور غیر شاداب سی ہوگئی ہے تاہم اس کی قوت نشو ونما اب تک آمادۂ ظہور و ارتقاء ہے اور اگر دہقان کا ہاتھ اور بارانِ رحمت کی نظر مہر میسر آجائے تو فوراً اس کی حالت میں انقلاب عظیم ہو جا سکتا ہے۔

بعینہ یہی حال سرزمین حیات ملت کا بھی ہے گو اس کی تمام سطح سرسبزی و شگفتگی کی جگہ خشکی و وحشت کا منظر ہو تاہم اگر کسی ایک گوشہ میں بھی چند سبز شاخیں اور پتے نظر آرہے ہوں تو نا امید نہ ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اس کی قوت نشو ونما ابھی تک فنا نہیں ہوئی اور دہقان کی محنت اور ابر کی بخشش اگر ساتھ دیں تو کچھ بعید نہیں کہ یہی وحشت کدۂ ارضی ایک جنت سماوی بنجائے۔

آج صدیوں سے سرزمین اسلام پر جو تنزل و انحطاط قلب و دماغ پر طاری ہے، اس کا منظر یقیناً دردانگیز ہے لیکن اس مایوسی میں جو چیز امید دلانے والی ہے وہ صرف یہ ہے کہ با این ہمہ خشک سالی اور قحط کے آثار گو ہر طرف ہیں مگر زمین اب تک بنجر اور شور ثابت نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زمانۂ شاداب اور وہ موسم نمو خیز اب چلا گیا جب ہماری سرزمین کے ایک ایک ذرے سے ناموران عالم اور ابطال ملت اُٹھتے تھے، اور دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے صفحوں پر قابض ہو جاتے تھے۔ تاہم اب بھی جب کبھی اسباب و وسائل ظہور جمع ہو جاتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے صدائے ابطال و امجاد کانوں میں آجاتی

ہے اور عالم اسلامی کا کوئی نہ کوئی گوشہ اوصاف وخصائل گرانمایہ کا نمونہ پیش کر دیتا ہے اور اس طرح یقین ہو جاتا ہے کہ زمین کی قوت نشو ونما اب تک معدوم نہیں ہوئی، اور یاس وقنوط کے وقت میں ابھی دیر ہے۔ اب بھی اگر اس زمین کی درستگی کیجائے اور وسائل زراعت مہیا ہو جائیں تو اس کا چپہ چپہ گلہائے عطر بیز اور درختہائے شاداب سے لہلہا سکتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۲ : ۷)	اس لیے کہ اللہ اور اس کی پراسرار قوتیں برحق ہیں اور اس لیے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور نیز اس لیے کہ وہ ہر مشکل سے مشکل بات پر قادر ہے۔

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

موجودہ دور اسلام کا ایک ایسا ہی فرزند جلیل وجود نبیل سرنامہ صحیفہ عظمت واجلال درافع منار الملت والاسلام الرجل العالم بطل ادرنہ غازی شکری پاشا (متع اللہ المسلمین، بطول حیاتہ وحفظ وجودہ من شر اعدائہ) ہے جب کہ جنگ بلقان کی پوری تاریخ ہمارے لیے دردانگیز وجانکاہ تھی جب کہ ملکوں پر ملکوں کے نکلنے اور شکستوں کے کھانے کی خبریں مسلسل و غیر منقطع تھیں، جبکہ مایوسی کی ایک گھٹا تھی جس نے ہر طرف سے ہمیں گھیر لیا تھا، جب کہ حسرت کے ساتھ تاریخ کے گذشتہ صفحات کو ہم پڑھتے، اور اپنی موجودہ نامرادیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے تھے جبکہ تاریخ عثمانی کی

فتحمندداستانیں ہمیں یاد آتی تھیں، اور ہم متعجب ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے، کہ اگر آج محمد فاتح، سلیم ثالث، اور بایزید یلدرم دنیا سے نابود ہو گئے ہیں، تو کیا کوئی عمر پاشا، احمد طوسون، اور عثمان پاشا بھی ترکوں میں باقی نہیں رہا؟ یعنی جب کہ غیروں کی فتح مندیوں نے ہمارے دلوں کو دونیم اور اپنی نامرادیوں نے ہماری عزت ہزار سالہ کو سرنگوں کر دیا تھا، تو پھر جنگ کے آخری ایام میں ایک اسی پیکر شجاعت و بسالت، ستون آہنیں، عزم و ثبات مدافعت قہرمان دفاع ملی، بلند ساز لوائے عزت اسلامی، اسلام پرست ارجمند و غیور، وجانفروش ملک و وطن محبوب کا وجود عظیم و جلیل تھا، جو ظلمت ناکامی میں نیر درخشندۂ حرب دفاع و استقلال، اور ضیا رتابان عظمت و جبروت و اجلال بن کر سماء مجد خالد پر نظر افروز نظارگیان عالم ہوا، اور اپنے حیرت انگیز خوارق دفاع، اور محیر العقول عزم و ثبات سے اس دور ناکامی و نامرادی میں عزت اسلامی و مجد عثمانی کو نابود و فنا ہونے سے بچا لیا! فالسلام علیك یا قدوۃ الابطال! والسلام علیك یا زبدۃ الامجاد!!

قوموں کی زندگی اپنے ناموران ابطال کی عزت و یاد سے وابستہ ہے۔ محاصرہ ادرنہ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ باتفاق موافق و مخالف، تمام تاریخ حرب عالم میں درجۂ اعزاز سے نمایاں ہے۔ تاریخ قریب کے مشہور محاصرے مثل پیرس، سباسٹوپول، پلیونا، لیڈی اسمتھ، پورٹ آرتھر ہمارے سامنے ہیں، اور جب تمام حالات و واقعات کا مقابلہ کرتے ہیں، تو یہ آخری محاصرہ محاصرے کے ہر پہلو، بلکہ عام جزئیات تک میں اپنا نظیر و مماثل نہیں رکھتا۔

اس واقعہ کی عظمت نے یورپ کے ارباب بینش و انصاف کی گردنیں جھکا دی ہیں۔ فرانس اور جرمنی کی فوجی حلقوں اور مشہور اخبارات نے تحریکیں شروع کر دی ہیں کہ اس وقائع عظیم کے اعتراف کے ثبوت میں ان کے ملک و قوم کی طرف سے غازی شکری پاشا کو تحائف دیے جائیں۔ مصر میں بھی اس کی تجویز ہو چکی ہے اور ترکوں نے تو اس کا سامان بھی کر لیا ہے۔